مواعظ حکیم الامت اور دینی رسائل کی اشاعت کا امین

ماہنامہ
الامداد
لاہور
پاکستان

مدیر مسئول
مشرف علی تھانوی

مدیر
خلیل احمد تھانوی

جلد ۱	ذی الحجہ ۱۴۲۰ھ / مارچ ۲۰۰۰ء	شمارہ ۴

التہذیب (۶)

اصلاحِ نفس کا طریقہ

از افادات: حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی قدس سرہ

عنوانات و حواشی: مولانا خلیل احمد تھانوی

قیمت فی پرچہ ۱۰/- روپے ○ زرِ سالانہ ۱۰۰/- روپے

پتہ دفتر
ماہنامہ
الامداد
جامعہ دار العلوم الاسلامیہ
۲۹۱ کامران بلاک علامہ اقبال ٹاؤن لاہور
فون نمبر
۵۴۲۲۲۱۳-۴۴۸۰۶۰

ناشر
مشرف علی تھانوی
مطبع: ہاشم اینڈ حماد پریس
مقام اشاعت
جامعہ دار العلوم الاسلامیہ لاہور پاکستان

حج سے محبت کا بڑھنا ایک ایسا امر ہے کہ ہر مسلمان اس کو سمجھتا ہے چنانچہ ہر شخص اپنے قلب میں بیت اللہ شریف کی طرف ایک کشش اور انجذاب[1] محسوس کرتا ہے، اور جو وہاں گئے ہیں ان سے پوچھ لو کہ کیا حالت ہوتی ہے کہ خانہ کعبہ کو دیکھتے ہی دل بے قابو ہوجاتا ہے۔ اور بالاضطرار آنسوؤں کا مینہ برسنے[2] لگتا ہے۔ اور یوں معلوم ہونے لگتا ہے کہ خانہ کعبہ پر ضرور کوئی جلوہ گر ہے۔ ورنہ ایک تعمیر میں رولانے کا اثر کیا معنی؟۔

چرخ کو کب یہ سلیقہ ہے ستمگاری میں
کوئی معشوق ہے پردۂ زنگاری میں

(از حضرت حکیم الامتؒ)

---

(۱) کھچاؤ (۲) بلااختیار آنسوؤں

وعظ التہذیب نمبر:٦

اسرارِ حج

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمدللہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ و نومن بہ و نتوکل علیہ و نعوذ باللہ من شرور انفسنا و من سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ و من یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الہ الا اللہ وحدہ لاشریک لہ ونشھد ان سیدنا و مولینا محمداً عبدہ ورسولہ صلی اللہ تعالی علیہ وعلی آلہ واصحابہ و بارک وسلم۔

اما بعد: فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم . بسم اللہ الرحمن الرحیم . وللہ علی الناس حج البیت من استطاع الیہ سبیلا و من کفرفان اللہ غنی عن العلمین[1]

تمہید:

چند سال سے میرا معمول ہے اور ترتیب کا بھی یہی مقتضا[2] ہے کہ بعد گذر جانے رمضان المبارک کے حج کے متعلق بیان کیا کرتا ہوں اور نیز اشہر حج شوال سے

(۱) آل عمران آیت ۹۷ (۲) ترتیب بھی اسی بات کا تقاضا کرتی ہے

شروع بھی ہوتے ہیں اس لیے کہ اشہر حج شوال ذوالقعدہ ذوالحجہ ہیں۔

ہر چند کہ شوال اور ذوالقعدہ پورے پورے اور ذی الحجہ کا ایک معتد بہ[1] حصہ یہ اتنی مدت ہے کہ فی نفسہ ضروری نہیں تھا کہ شروع شوال ہی میں اس کو بیان کیا جائے اس مدت کے اندر اندر جب چاہے بیان کردیا جاتا۔ لیکن چونکہ ہم لوگ مکہ معظمہ اور عرفات سے مسافت بعیدہ[2] پر ہیں تو اگر بیان کو موخر[3] کیا جائے گا۔ تو جن لوگوں کا بیان سن کر جانے کا خیال ہوگا وہ نہیں جاسکتے اس لیے معمول یہی ہے کہ شروع شوال میں بیان کردیا کرتا ہوں۔

اس مرتبہ بعض روایات[4] سے معلوم ہوا تھا کہ راستہ کے خطرناک ہونے کی وجہ سے پہنچنے میں شبہ ہے تو بعض روایتوں[5] سے امن معلوم ہوا لیکن اکثر روایات سے شبہ قوی ہوتا چلا گیا۔ اس لیے ارادہ تھا کہ اس بیان کو ملتوی کردوں لیکن غور کرنے کے بعد مصلحت یہی معلوم ہوئی کہ بیان کیا جائے اس لیے کہ یہ کیا ضرور ہے کہ ہم کو شبہ ہو تو سب کو ہی ہو اور اگر ہو بھی تو تحقیق کرلیں گے۔ اور اگر نہ بھی تحقیق کریں یا تحقیق کے بعد بھی شبہ رہے تو کم از کم احکام سے تو فی نفسہا[6] اطلاع ہوجائیگی۔ جو شخص شرائط کے اعتبار سے ضروری سمجھے گا وہ ارادہ کریگا ورنہ فی نفسہ حج ایک رکن اسلام ہے اس کے آثار و خواص کا علم ہی ہوجائیگا اور نیز اس عبادت کی عظمت ذہن میں آجائیگی یہ بھی بڑا فائدہ ہوا۔ ان وجوہ سے یہی مناسب معلوم ہوا کہ اس کا ذکر ترک نہ کروں۔ اس لیے میں نے یہ آیت پڑھی ہے۔

میں اس وقت حج کی فرضیت اور فرعی مسائل بیان نہ کروں گا۔ اس لیے کہ

---

(۱) ذوالحجہ کا بھی ایک قابل شمار حصہ دس بارہ روز (۲) عرفات سے دور رہتے ہیں (۳) اگر بیان میں دیر یہ تاخیر کی جائیگی (۴) بعض لوگوں کے بتانے سے معلوم ہوا (۵) اور بعض لوگوں کے بتانے سے معلوم ہوا کہ راستہ پر امن ہے (۶) کم از کم احکام حج تو معلوم ہوجائیں گے

فرض ہونے کو تو سب جانتے ہیں اور مسائل اس کے اردو کے رسائل میں موجود ہیں اور نیز اس وقت ان کا بیان کرنا بھی زیادہ مفید نہیں اس لیے کہ حج کے مسائل یاد ہی نہیں رہتے۔ میں اس کے متعلق بھی ایسے ہی مضامین بیان کرنا چاہتا ہوں۔ جیسے روزہ اور تراویح وغیرہ کے متعلق بیان کیے ہیں یعنی لطائف اور اسرار اور روح اور جوہر اس عبادت کا بیان کروں گا۔ اس سے اعتقاد فرضیت بھی بوجہ احسن موکد[1] ہوگا اور نیز اس کی عظمت اور وقعت بھی پیدا ہوگی۔ اس لیے زیادہ مہتم بالشان[2] اسی کا ذکر کرنا ہے اور وہ مضمون مخترع[3] نہ ہوگا۔ بلکہ صیام و قیام کے مضامین کی طرح انشاء اللہ تعالیٰ نصوص[4] سے تائید ہوتی چلی جائیگی۔

نوعیت مضمون

میں نے جو آیت تلاوت کی ہے وہ اس مضمون کے استنباط کے لیے کافی وافی ہے[5] لیکن کچھ مقدمات صحیحہ اس میں منضم[6] کرنے کی ضرورت ہوگی۔ اب میں اس مضمون کی نوعیت کی تعیین کرتا ہوں اور ہر چند کہ اس تعیین کی ضرورت نہ تھی۔ اس لیے کہ جو مضامین صیام و قیام کے متعلق بیان کیے گئے ہیں۔ ان کا یاد کرلینا کافی ہے۔

چنانچہ میں نے روزہ تراویح اور اس کی تقریب سے اعتکاف کے متعلق یہ بیان کیا تھا اور یہ بھی بیان کیا تھا کہ ان مجاہدات کی تکمیل اعتکاف سے ہوتی ہے یعنی اعتکاف کو بھی مجاہدہ میں داخل کیا گیا تھا یہ حاصل تھا ان مضامین کا یہی نوعیت

(۱) اس سے فرضیت کا اعتقاد کی بھی اچھی طریقہ سے تائید ہوجائیگی (۲) اہتمام کے لائق (۳) گھڑا ہوا (۴) قرآن و حدیث سے تائید ہوتی جائیگی (۵) اس مضمون کو قرآن سے ثابت کرنے کے لیے جس آیت کا انتخاب کیا ہے وہ ہر اعتبار سے کافی ہے (۶) کچھ مقدمات کو اس میں شامل کرنیکی ضرورت ہوگی

حج کے متعلق بھی ہے۔

جس کا خلاصہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے اپنے بندوں پر بڑی رحمت فرمائی ہے کہ ان کو تطہیر قلب و تزکیۂ نفس[1] کے ایسے طریقے تعلیم فرمائے ہیں کہ فلسفی اور کسی مرتاض اور کسی اشراقی کو وہاں تک رسائی ہونا کیا معنی اس کی ہوا تک بھی نہیں پہنچی یہ بجز[2] وحی کے کسی واسطہ سے معلوم نہیں ہوسکتے تھے۔ چنانچہ ان مجاہدات کی تفصیل میں غور کرنے سے یہ امر بین طور[3] سے واضح ہے یہاں تک بیان تھا اس مضمون کی نوعیت کے متعلق۔

مقصود بیان

اب آگے مقصود شروع کیا جاتا ہے ہر چند کہ خصوصیت کا مقتضی یہ ہے کہ حج کا ذکر اس وقت کیا جائے تو قربانی کا ذکر عید الاضحیٰ میں ہو لیکن جو مضمون میں بیان کرنا چاہتا ہوں۔ اس کا تعلق جیسا حج سے ہے۔ ایسا ہی قربانی سے بھی ہے اور نیز قربانی حج کامل کے بعض اقسام کا جزو بھی ہے۔

اور کامل کی قید میں نے اس لیے لگائی ہے کہ قربانی نفس حج کا جزو نہیں ہے نفس حج تو وقوف عرفات اور طواف زیارت سے ادا ہوجاتا ہے ہاں کمال اس کا قربانی سے ہے۔

پس جبکہ قربانی بھی اس کا جزو ہے گو کسی[4] درجہ میں ہو جیسا ابھی مذکور ہوا کہ حج کا جزو ہے (قران و تمتع کا)[5]

---

(۱) دل کو پاک کرنے اور نفس کو سنوارنے کے (۲) سوائے وحی کے (۳) پورے طور پر سمجھ میں آتی ہے (۴) حدیث شریف میں بھی وارد ہے افضل الحج العج والثج اس سے بھی قربانی کا مہتم بالشان ہونا معلوم ہوتا ہے ۱۲۔ جامع (۵) یعنی حج قران اور حج تمتع میں قربانی کیجاتی ہے اور حج افراد میں نہیں

تو یہ نامناسب ہے کہ حج کے متعلق تو بیان ہو اور اس کے ایک بڑے جزو کا بیان ترک[1] کردیا جاوے اس سے حج کا بیان بھی ناتمام رہے گا اس لیے کہ حج نام ایک افعال کے مجموعہ کا ہے جس میں بعض احوال میں قربانی بھی داخل ہے اور نیز ایام عیدالاضحیٰ میں قربانی کے احکام بیان کرنے کی ضرورت ہوگی اور اس وقت احکام نہ بیان کیے جائیں گے۔ بلکہ قربانی کی روح اور حقیقت اور اسرار، کا بیان ہوگا۔ اس لیے ایام ذی الحجہ کا انتظار نہیں کیا گیا اور اسی طرح حج کا بیان بنی احکام تفصیلہ کے بیان سے نہ ہوگا۔ جیسا پہلے بھی ذکر کیا گیا ہے اس لیے کہ وہ احکام یاد نہیں رہتے اور نیز خود بیان کرنے والوں کو یاد نہیں جیسے ایک طوطے کو کسی نے الم ترکیف تک سورتیں یاد کرادیں تھیں۔ جب اس سے کوئی پڑھواتا تھا۔ تو وہ فرفر[2] پڑھ دیا کرتا تھا۔ اور جب کہتے کہ آگے پڑھو تو وہ کہتا تھا کہ آگے تو میاں کو بھی یاد نہیں۔

عجیب دربار

اسی طرح احکام حج کے تو مجھے بھی یاد نہیں بیان تو کیا کروں گا اور اگر کسی کو یاد بھی ہوں تب بھی وہاں جاکر نئے استاد کی ضرورت ہوتی ہے وہاں سب پڑھا لکھا بھول جاتا ہے۔ ع

جو پڑھا لکھا تھا نیاز نے اسے صاف دل سے بھلا دیا۔

مولانا رحمت اللہؒ راوی[3] ہیں کہ بہت بڑے عالم مکہ معظمہ حج کے لیے آئے جب مطوف معلم طواف کرانے کے لیے ان کے پاس آیا تو انہوں نے فرمایا کہ ہم کو معلم کی ضرورت نہیں ہم خود واقف ہیں۔ معلم الگ ہو گئے جب حرم

(۱) چھوڑ دیا جائے (۲) جلدی جلدی (۳) بیان کرتے ہیں

شریف میں پہنچے تو باب السلام سے داخل ہوتے ہیں اور باب السلام دو ہیں ایک احاطہ میں اور ایک بالکل اندر باہر کے باب السلام میں تو انہوں نے غلطی نہیں کی۔ لیکن جب اندر پہنچے تو اندر کے باب السلام سے داخل نہ ہوئے۔ ایک بچہ نے اسی وقت تبلادیا یا شیخ ادخل من ھنا اے شیخ ادھر سے داخل ہوجیئے جب آگے طواف کے لیے پہنچے تو حکم یہ ہے کہ حجر اسود کو بوسہ دیکر داہنی طرف جس طرف خانہ کعبہ کا دروازہ ہے چلنا چاہیئے وہ بائیں طرف کو چلے اسی وقت لڑکے نے بتلادیا اور کہا اخطات یا شیخامش من ھنا یعنی اے شیخ آپ نے خطا کی اس طرف سے چلیے۔ جب بار بار ان سے غلطی ہوئی تو انہوں نے فرمایا کہ خدا تعالیٰ نے میرا تکبر توڑا ہے واقعی یہاں بغیر معلم[1] کے کام نہیں چلتا۔ اس وقت انہوں نے معلم کو بلایا وہ عجیب دربار ہے وہاں اچھے اچھے عقلا بھی بے عقل ہوجاتے ہیں۔ اور وجہ اس کی یہ ہے کہ وہاں جاکر ایک حیرت[2] اور کیفیت طاری ہوتی ہے کہ جس سے عقل ایک طرف رہ جاتی ہے اس لیے میں احکام بیان نہ کروں گا۔ خلاصہ یہ ہے کہ حج اور قربانی دو مضمون ہوں گے پہلے مواعظ میں نماز اور روزہ کے متعلق بیان تھا۔ دو عبادتوں کا آج ہوگا۔ ارکان اسلام کے کل پانچ ہی ہیں تلفظ شہادتین[3] جس کا بیان محتاج بیان نہیں۔ نماز، روزہ، حج، زکوۃ جس میں سے بجز زکوۃ کے سب کا بیان ہوجائے لیکن طبعاً[4] زکوۃ کا بیان آجائیگا۔

(۱) سکھانے والے (۲) یہ حیرت کم و بیش ہر مسلمان کو طاری ہوتی ہے اور اگر کسی کو نہ ہو تو وہ سمجھ لے کہ اس کا سبب قساوت قلب اور غفلت (دل کی سختی اور لاپروائی) ہے جیسے قرآن اور نماز سے بعضے متاثر نہیں ہوتے۔ لیکن اس سے محزون (غمگین) نہ ہو بلکہ علاج میں مشغول ہو ۱۲ جامع (۳) کلمہ شہادت کا پڑھنا محتاج بیان اس لیے نہیں کہ بغیر ایمان کے تو کوئی بھی عبادت قبول نہیں ہوتی (۴) ضمناً

اقسام مجاہدہ

قبل اس کے کہ حج کے متعلق کچھ بیان کیا جائے مواعظ سابقہ[1] کے حاصل کو سمجھنا چاہیے اور وہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے محض اپنی رحمت سے تطہیر قلب و تزکیہ نفس[2] کے واسطے کچھ مجاہدات اپنے بندوں کو تعلیم فرمائے ہیں اور ان مجاہدوں کی مختلف قسمیں ہیں۔ مثلاً ایک مجاہدہ روزہ ہے ایک نماز ہے ایک زکوۃ۔ منجملہ[3] ان مجاہدات کے حج اور قربانی بھی ہے مواعظ سابقہ میں روزہ نماز کے متعلق بیان ہوچکا ہے۔ پس اگر ایام حج بھی اس وقت نہ ہوتے۔ تب بھی چونکہ بعض مجاہدات کا بیان ہوچکا ہے تو مجاہدہ ہونے کے اعتبار سے حج کا بیان بھی ضروری تھا یہ حسن اقتران[4] ہے کہ ایام بھی اس عبادت کے یہی ہیں۔

ان اقسام مختلفہ[5] میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کل دو رنگ یا دو نوع[6] کے مجاہدے ہیں ایک وہ مجاہدہ ہے جس میں عقلیت کی شان غالب ہو اور ایک وہ ہے جس میں ادراک بالعقل غالب نہ ہو بلکہ اس میں طبیعت اور تعبدیت[7] غالب ہوا۔

اور راز اس تنویع[8] میں یہ ہے کہ مجاہدہ کا حاصل منازعات نفس کا مغلوب[9] کرنا ہے یعنی جو قویٰ طاعت میں کشا کشی کریں۔ ان کو مغلوب کردینا[10] اور دبا دینا مقصود ہے اور وہ منازعات[11] مختلف قسم کے ہیں۔ کوئی مجاہدہ کسی منازعت کے مغلوب کرنے کے لیے ہے اور کوئی کسی منازعت کے دبانے

---

(۱) پہلے بیان کردہ مواعظ (۲) دل کو پاک کرنے اور نفس کو سنوارنے (۳) انہی مجاہدات میں سے (۴) یہ اچھا اتفاق ہے کہ حج کا مجاہدہ بھی ان مجاہدات سے نکل گیا (۵) ان مختلف قسموں میں (۶) قسم (۷) جس میں عقلیت کا غلبہ نہ ہو بلکہ طبیعت اور بندگی کا غلبہ ہو (۸) ان مختلف قسم کے مجاہدات میں راز یہ ہے (۹) نفس کی مخالفت کو دبانا ہے (۱۰) یعنی جو قوتیں اطاعت خداوندی میں رکاوٹ ڈالیں ان کو مغلوب کرنا ہے (۱۱) اور رکاوٹیں مختلف قسم کی ہوتی ہیں

کے لیے۔ چنانچہ نماز سے جاہ کو دبانا مقصود ہے۔ اور قوت بہیمہ کا انکسار روزہ سے مطلوب ہے۔ غرض مجاہدہ کی حقیقت منازعات کو مغلوب کرنا ہے۔

مانع حق عقل

اس کے بعد سمجھنا چاہیئے۔ کہ منازعت کرنیوالی کیا کیا چیز ہے؟ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ منازعت کرنیوالی آدمی کے اندر دو شے[1] ہیں۔ عقل اور طبیعت۔ یہی دو چیزیں انسان کو حق سے روکتی ہیں۔ چنانچہ حکماء کو جس شے نے اتباع حق سے روکا اور انبیاء کا اتباع نہیں کرنے دیا وہ عقل ہی ہے اس لیے کہ طبیعت کے اقتضاءات[2] کا تو انہوں نے بخوبی علاج کرلیا تھا۔ چنانچہ اخلاق ان کے مہذب تھے نفس کا تزکیہ بالکلیہ کرلیا تھا۔ بڑے بڑے مجاہدات سے وہ شائستہ ہوگئے تھے اس لیے طبعی منازع تو ان میں بالکل نہ تھے صرف عقل ان کی اتباع سے مزاحم ہوتی تھی چنانچہ ایک آیت میں حق تعالیٰ نے اس کی طرف اشارہ بھی فرمایا ہے فرماتے ہیں **فرحوا بما عندهم من العلم**[3]۔ یعنی اپنے علم پر اترا گئے اپنے علوم کے سامنے انبیاء کے علوم کو پست سمجھتے تھے جیسے مدعیان عقل قرآن شریف پر اعتراض کیا کرتے تھے کہ قرآن میں تو معمولی مضمون ہیں۔ کہیں مچھر کا ذکر ہے کہیں مکھی کا۔ اللہ میاں کا کلام اور ایسی حقیر چیزوں کا ذکر اللہ تعالیٰ جیسے عظیم الشان ہیں۔ ایسی ہی چیزوں کا ذکر ہونا چاہیئے اور احمق یہ نہ سمجھے کہ مچھر اور مکھی کا ذکر قرآن مجید میں بطور تمثیل کے ہے اور تمثیل کے اندر یہ ضروری ہے کہ ممثل لہ[4] جس درجہ کا ہو مثال بھی اسی درجہ کی ہوتی ہے چنانچہ بتوں کی کمزوری دکھانے کے لیے ان کو مکھی سے تشبیہ دی ہے چنانچہ ارشاد ہے **وان**

---

(۱) چیزیں (۲) طبیعت کے تقاضوں (۳) سورۃ المومنین آیت ۸۳ (۴) جس کے لیے مثال بیان کیجائے

یسلبھم الذباب شیئا لا یستنقذوہ[1] اور اللہ تعالیٰ کے سوا دوسرے کو اللہ ماننے کو مکڑی کے جالے کے ساتھ تشبیہ دی ہے اور اگر مشبہ اور مشبہ بہ[2] میں تناسب کی رعایت نہ ہو تو جو تشبیہ سے غرض ہے وہ فوت ہو جائے گی۔ پس پابندان خیال محققین کے کلام کو ہمیشہ بوجہ اپنی کم فہمی[3] کے پست[4] اور معمولی بتاتے چلے آئے ہیں اسی طرح انبیاء علیہم السلام کو اور ان کی کلام کو معمولی بات کہتے چلے آئے ہیں۔

علوم انبیاء علیہم السلام

اور راز اس میں یہ ہے کہ انبیاء اور محققین کو اصل میں نفع رسانی[5] مقصود رہی ہے نافع مضمون[6] کی شان ہمیشہ یہ ہوتی ہے کہ اس سے عوام سے لیکر خواص تک نفع حاصل کریں اور نافع[7] حاصل کریں اور ایسے مضامین عجیب و غریب نہیں ہوتے۔ بلکہ سننے سے معمولی معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن اگر ان پر عمل کیا جائے تو اس وقت ان کا نفع معلوم ہوتا ہے اور جس قدر ان میں غور کیا جاتا ہے اسی قدر زیادہ باریکیاں اس میں نکلتی ہیں اور حقائق دقائق اور مضامین غامضہ[8] سے چونکہ کوئی نفع نہیں اس لیے انبیاء اور ان کے جانشین ایسے مضامین بیان نہیں فرماتے نہ اس وجہ سے کہ ان کو معلوم نہیں بلکہ اس وجہ سے کہ وہ فہم[9] عوام سے باہر ہیں اور نیز کوئی نفع بھی نہیں۔

اس کو ایک مثال کے ضمن میں سمجھنا چاہیئے کہ حکیم محمود خاں کی دو مقام

(۱) سورۃ الحج آیت ۷۳ (۲) جس کو جس سے تشبیہ دی جا رہی ہے دونوں میں مناسبت ضروری ہے (۳) کم سمجھی (۴) گھٹیا (۵) لوگوں کو فائدہ پہنچانا (۶) مفید مضمون (۷) فائدہ اٹھاتے ہیں (۸) مشکل مضامین (۹) عوام کی سمجھ

میں دو شانیں ہیں ایک تو جس وقت وہ طالب علموں کو پڑھاویں اور ایک جس وقت نسخہ لکھیں تو اگر کوئی شخص مطب میں ان کو دیکھ کر کہے کہ میں نے تو سنا تھا کہ حکیم محمود خان صاحب طب کے بڑے عالم ہیں یہ تو کچھ بھی نہیں۔ سونف، کاسنی تو کوئی بتادے تو وہ شخص احمق ہے اس کو یہ عقل نہیں کہ جو لوگ ان کے پاس اس وقت جمع ہیں یہ مریض ہیں ان کے لیے یہی مناسب ہے۔ اگر اس کو طب کی تحقیقات سننے کا شوق ہے تو اس کو چاہیئے کہ وہ اس وقت کا انتظار کرے جب کہ وہ طالب علموں کو نفیسی اور قانون[1] کا سبق پڑھاتے ہیں۔

اسی طرح انبیاء کے دو موقع ہیں۔ ایک تو جبکہ عوام سے خطاب کرتے ہیں ایک وہ جبکہ خواص ان کے مخاطب ہوتے ہیں۔ خواص کو جو خطابات ہوتے ہیں ان کے بیان کرنے کی حاجت نہیں ان کی مثال ایسی ہے جیسے حضور ﷺ کو خطاب الم حمعسق کھیعص[2]۔ اب ان حروف کے معانی بجز حضور ﷺ کے کوئی نہیں سمجھا۔ کسی شخص نے کسی بزرگ سے معراج کے متعلق پوچھا تھا کہ وہاں کیا کیا باتیں ہوئی اس کا کیا خواب جواب دیا ہے۔

اکنوں کرا دماغ کہ پرسد زباغباں
بلبل چہ گفت و گل چہ شنید وصبا چہ کرد

میاں عاشق و معشوق رمزیست کراما کاتبین راہم خبر نیست[3]

خود ملائکہ حامل وحی کو بھی خبر ہونا ثابت نہیں کہ ان لفظوں کے کیا معنی

---

(۱) طب کی دو کتابوں کے نام ہیں (۲) ان حروف کو حروف مقطعات کہتے ہیں اور یہ قرآن کریم کی بعض سورتوں کے شروع میں آئے ہیں جن کے معانی سوائے حضور ﷺ کے کوئی نہیں جانتا (۳) کن کے پاس اتنا دماغ ہے کہ باغبان سے پوچھے کہ بلبل نے کیا کہا پھول کیا سنا اور ہوا نے کیا کیا۔ یہ عاشق و معشوق کے اشارات ہیں جن کی کراما کاتبین (اعمال لکھنے والے فرشتے) کو بھی خبر نہیں مطلب یہ ہے کہ ۔۔ ن میں اللہ اور رسول کے درمیان کیا باتیں ہیں کسی کو خبر نہیں

ہیں ایک مرتبہ کانپور میں - میں یہی تقریر کر رہا تھا- ایک کورٹ انسپکڑ بھی موجود تھے- ان کو اس سے بڑا حظ[۱] ہوا اور کہنے لگے کہ یہ بالکل صحیح ہے- اور انہوں نے حکایت بیان کی کہ میں اُناؤ میں سپرنٹنڈنٹ پولیس کے پاس بیٹھا تھا- ان کے پاس ایک کتاب رکھی تھی- میں اٹھا کر دیکھنے لگا کہنے لگے کہ تمہارے کام کی نہیں تم نہیں سمجھو گے یہ خاص اصطلاحیں خفیہ پولیس کی ہیں جن کو وہ باہم سمجھتے ہیں لیکن تشریع[۲] عام سب کو بتائی گئی ہے یہ ایسے خطابات ہیں کہ سوائے حضور ﷺ کے دوسرا نہیں سمجھتا-

اور یہ بھی ممکن ہے کہ حضور ﷺ کی برکت سے بعض خواص اولیاء اللہ کا فہم[۳] بھی ان کے کسی حصہ تک پہنچا ہو- چنانچہ شیخ اکبر نے اوائل سورہ روم سے نفع سور تک کے حالات مع قید و سن و مع قید ناموں[۴] کے سمجھ کر لکھ دیے ہیں - لیکن زبان ایسی اختیار کی ہے کہ ہر کوئی ان اصطلاحوں کو نہیں سمجھ سکتا اور کسی شخص نے اس کی شرح بھی لکھی ہے- مگر ان بھلے مانس[۵] نے بھی ایسے طور[۶] سے لکھا ہے کہ ہر کوئی نہیں سمجھ سکتا- اور اس پر بھی بہت قسمیں دی ہیں کہ اگر کوئی سمجھ جائے تو کسی سے ظاہر نہ کرے--

غرض انبیاء اور اولیاء کے سینوں میں وہ علوم غامضہ[۷] ہیں کہ بڑے بڑے عقلاء وہاں تک نہیں پہنچ سکتے- ان احمقوں نے اس پر نظر تو نہیں کی نظر اس پر کی کہ عوام سے جو ان کے خطابات ہیں وہ معمولی ہیں حالانکہ یہ خطابات بھی ان کے غایت علو درجہ پر دال ہیں[۸]-

---

(۱) بہت لطف آیا (۲) شریعت کے عام احکام سب کو بتانے گئے ہیں (۳) سمجھ (۴) سن و ناموں کے ذکر کے ساتھ (۵) اچھے انسان (۶) ایسے طریقے (۷) دقیق علوم (۸) ان کے مرتبے کی بلندی کی طرف نشاندہی کرتے ہیں

اس کی ایسی مثال ہے جیسے دو شخص ہیں ایک تو شرح[۱] ملا تک پڑھا ہوا ہے تو وہ اگر میزان الصرف[۲] پڑھاوے تو اس قدر عجیب نہیں اور ایک دوسرا شخص جو علم کے اندر ایک بحر ذخار[۳] ہے وہ اگر میزان پڑھاوے اور آسان کر کے پڑھاوے تو اس کا کمال ہے اس لیے کہ میزان کے ہر صفحہ پر جو اسکی نظر پڑے گی۔ تو ہر ہر جملہ پر اس کو علم کا بے انتہاء خزانہ نظر آئیگا اور بڑے بڑے مضامین اس کے سامنے آئیں گے اور وہ ان کو اپنے درجہ سے تنزل[۴] کر کے نہایت سہل عنوان سے بیان کریگا - اسی طرح انبیاء علیہم السلام مضامین عالیہ[۵] کو نہایت سہل عنوان سے بیان فرماتے ہیں شاعر کا بڑا کمال یہ ہے کہ شعر سہل ٹھیٹھ زبان میں کہے اور پھر مضمون اچھا ہو۔

حضرت حاجی صاحبؒ فرماتے تھے کہ حق تعالٰی کی قدرت جیسی بڑے حسین کو پیدا کرنے سے ظاہر ہوتی ہے اس سے بڑھ کر بد صورت کے پیدا کرنے سے معلوم ہوتی ہے۔ کامل خوشنویس اگر بگاڑ کر ایسا لکھدے کہ بد خط معلوم ہو یہ اس کا کمال سمجھا جائے گا۔ پس صنائع اور بدائع سے جیسے حضرت حق کا کمال ظاہر ہوتا ہے۔ ناقص کو دیکھ کر اس سے زیادہ استدلال ہوتا ہے بڑا فصیح و بلیغ اگر دیہات کی زبان میں گفتگو کرے تو یہ اس کا غایت کمال ہے۔ حضرت مولانا گنگوہیؒ گنواروں کے ساتھ گاؤں کی زبان میں گفتگو فرمایا کرتے تھے۔ تو بہت ہی بھلا معلوم ہوتا تھا۔ بڑے آدمی بچوں کے ساتھ بچوں کی سی بولی بولا کرتے اور اگر مخاطب کے رتبے کے موافق نہ بولیں تو ایسے خطاب سے کچھ فائدہ نہیں۔

جیسے لکھنؤ میں ایک مولوی صاحب تعلقہ دار تھے گاؤں کے کاشتکار ان کے

---

(۱) علم نحو کی کتاب ہے شرح ملا جامی (۲) علم صرف کی ایک کتاب کا نام ہے (۳) علم کا سمندر ہے (۴) اپنے مرتبہ سے نیچے اتر کر بیان کریگا (۵) بڑے بڑے مضامین کو آسان کر کے بیان کرتے ہیں

پاس آئے تو آپ ان سے پوچھتے ہیں امسال آپ کے کشت زار گندم پر تقاطر امطار ہوا یا نہیں[1]۔ تو وہ چودھری آپس میں ایک دوسرے کو کہنے لگے کہ بھائیو! ٹھہر کر آئیو ابھی تو میاں قرآن پڑھ رہے ہیں تو آپ فرماتے ہیں کہ میں نے تو بہت مبتذل لغت[2] بولے ہیں۔ پس اگر حضرات انبیاء علیہم السلام اپنے مقام رفیع پر رہ کر گفتگو کریں تو ایک حرف بھی کسی کی سمجھ میں نہ آوے اور حضرات انبیاء علیہم السلام کا مقام تو بہت عالی ہے۔ اولیاء امت میں ایسے ہوئے ہیں کہ انہوں نے جب اپنے مقام پر رہ کر کلام کیا ہے تو ان کے ہمعصروں کو سمجھ میں نہیں آیا۔ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی صاحبؒ پر حال غالب تھا۔ اور حضرت مولانا گنگوہیؒ اپنے حال پر غالب تھے اسی واسطے حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کو ان کا حال اپنے رتبہ کے موافق کلام کراتا تھا۔ ایک مرتبہ رامپور میں آئے اور تقریر فرمائی جو لوگوں کی سمجھ میں نہیں آئی کسی عامی نے کہا کہ ہم تو سمجھے نہیں ایک بزرگ نے جواب دیا کہ افسوس ایک شہباز عرش کا کہ جس کا پرواز عرش پر ہے۔ اس سے درخواست کی جاتی ہے کہ زمین پر اتر کر چلے۔ مولانا حال رفیع رکھتے تھے۔ اور ایک احمق تھے اس سے سمجھ لیجیے کہ اگر انبیاء اپنے مقام رفیع[3] سے کلام فرماتے تو کون سمجھتا۔

کلام خداوندی

اور اس سے آگے اور نظر کو وسعت دیجیے کہ اگر خدا تعالیٰ ہماری طاقت فہم سے بالاتر کلام فرماتے تو کیا ہوتا۔ وہ کلام کیا ہوتا ایک تجلی خاص ہوتی کہ اس کے

---

(۱) آپ کے گندم کے کھیت میں بارش ہوتی کہ نہیں ہوتی (۲) بہت آسان لغت بولی ہے (۳) بلند مقام سے

ظہور ہوتے ہی ایک متنفس[۱] بھی باقی نہ رہتا۔

چوں سلطاں عزت علم در کشد — جہاں سر بجیب عدم در کشد

یہ حق تعالیٰ کی رحمت ہے کہ اپنے کلام کو الفاظ حادثہ[۲] کا لباس پہنا کر متجلی فرمایا ہے اگر کلام قدیم اپنی قدم کی حالت سے متجلی[۳] ہوتا تو نہ میں ہوتا نہ تم ہوتے۔ پس یہ رحمت ہے کہ یہ کلام الفاظ حادثہ کی صورت میں نازل ہوا ہے۔ لیکن الفاظ ہی تک نہ رہنا چاہیئے کسی نے خوب لکھا ہے۔

البحر بحر علی ماکان فی قدم
ان الحوادث امواج و انہار

لایحجبنک اشکال تشاھدھا — عمن یشکل فیھا فھی استار[۴]

یعنی الفاظ ہی کی طرف نظر نہ رکھنا چاہیئے الفاظ بمنزلہ قشر ظاہر کے ہے اور صفت کلام جو قدیم ہے جس کی یہ صورت ہے وہ بمنزلہ مغز اور لب کے ہے اور ان الفاظ کے مدلولات بمنزلہ قشر باطن کے ہے گویا یہ مدلولات صفت قدیم اور ان الفاظ حادثہ کے درمیان ایک برزخ ہے کہ جس کے اندر قدم اور حدوث دونوں شان ہے مختلف درجات میں یعنی اس مدلول کا ایک درجہ تو وہ ہے جس کو کلام نفسی کا مدلول کہا جاسکے وہ مثل دال کے قدیم ہے اور دوسرا درجہ جس کو کلام لفظی کا مدلول کہا جا سکے وہ مثل اپنے دال کے حادث ہے ان میں معانی کا مشاہدہ کرنا چاہیئے[۵] اور گو یہ

---

(۱) کوئی جاندار بھی زندہ نہ رہتا (۲) ختم ہونے والے الفاظ کے لباس میں معلوم الٰہی کو ظاہر کیا اسی لیے اہل سنت والجماعت کا یہ عقیدہ ہے کہ نفسی بات قرآن تو قدیم ہے اور لفظ حادث ہیں یہ علم کلام کی بحث ہے جس کی طرف حضرت نے اشارہ کیا ہے (۳) اللہ کا وہ کلام قدیم جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہیگا اپنی اصلی حالت پر ظاہر ہوتا تو ہم حادث ہونے کی وجہ سے اس کی تاب نہ لاسکتے (۴) سمندر تو سمندر ہی ہے جیسا کہ شروع سے ہے موجیں اور نہریں ختم ہوجایا کرتی ہیں تیرے لیے وہ شکلیں جن کا تو مشاہدہ کرتا ہے حجاب نہ بن جائیں اس حقیقی شکل سے جس تک پہنچنا مشکل ہے کہ یہ ظاہری شکل اس کے لیے بمنزلہ پردہ

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

وہ مرتبہ ہے جس کو عرفی نے جناب رسول اللہ ﷺ پر منطبق کیا ہے جناب وہ کہتا ہے۔

تقدیر بیک ناقہ نشانید دو محمل　　سلمائے حدوث تو دلیل ایست قدم را[1]

پس یہ مرتبہ حضور ﷺ کے لیے تو ثابت کرنا خلاف واقع کے ہے اور صحیح نہیں ہے ہاں البتہ مدلول کلام الٰہی کی یہی شان ہے مولانا شہیدؒ نے عرفی کے اس شعر پر رد[2] فرمایا ہے وہ یہ ہے کہ یہ تو ظاہر ہے کہ حضور ﷺ کا جسد عنصری حادث ہے اس کے قدم کا تو کوئی قائل ہو ہی نہیں سکتا۔ ہاں نور کے اندر کلام ہوسکتا ہے سو وہ بھی حدیث اول خلق اللہ نوری[3] سے حادث ہے اسلیے کہ خلق[4] ایک فعل ہے اور خلق کا تعلق نور سے ہوا ہے تو خلق خود حادث ہے اور نور اس کا اثر ہے وہ ضرور اس سے متاخر ہوگا[5] اور بدرجہ اولیٰ حادث ہوگا۔

(حاشیہ بقیہ صفحہ سابقہ)

کے ہے (۵) حکیم الامت تھانویؒ نے علم کلام کی ایک دقیق بحث کو مختصر الفاظ میں سمجھانے کی کوشش کی ہے جو علماء کے سمجھنے سے تعلق رکھتی ہے عام آدمی کا سمجھنا مشکل ہے مختصراً یہ سمجھ لیا جائے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات قدیم ہے یعنی ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہیگی اور اس کے علاوہ ساری مخلوق انسان سمیت حادث ہے یعنی پہلے نہیں تھی پیدا ہوئی اور پھر مر جائیگی اب سوال یہ ہے کہ قرآن اللہ کا کلام ہے اور قرآن نام الفاظ اور معانی دونوں کا ہے تو پھر اللہ کا کلام ہونے کی وجہ سے اس کے الفاظ کو بھی قدیم ہونا چاہیے۔ اس کی وضاحت کرتے ہیں کہ الفاظ کی دو حیثیتیں ہیں ایک یہ کہ اللہ اس کا تکلم کرتے ہیں اس حیثیت سے قدیم ہے ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہیگا اور الفاظ کا ایک تعلق انسان سے ہے کہ ہم اس کو پڑھتے ہیں اس حیثیت سے یہ مخلوق ہے اور حادث ہے اسی لیے اہل سنت والجماعت نے یوں کہا کہ نفسی باقرآن قدیم اور لفظی باقرآن حادث۔ اصل کلام تو وہ ہے جو اللہ نے تکلم کیا اور یہ الفاظ اس کے لیے بمنزل ظاہر کے ہیں۔ پس اتنا ہی سمجھ لیا جائے تفصیل کی گنجائش نہیں ۱۲ خلیل

---

(۱) تقدیر کی ایک اونٹنی پر دو کجاوے لدے ہوئے ہیں - حادثت سے تیرا محفوظ ہونا تیرے ہمیشہ سے ہونیکی دلیل ہے (۲) عرفی کے اس شعر کی تردید کی ہے (۳) اللہ نے سب سے پہلے میرے نور کو پیدا فرمایا اس حدیث کی روشنی میں آپ کا نور بھی پہلے نہیں تھا پھر پیدا ہوا (۴) پیدا کرنا (۵) بعد ہوگا

حقیقت محمدیہ

اس مقام پر ایک اور بات بھی سمجھنے کے لائق ہے وہ یہ ہے کہ بعضوں کو صوفیہ کی ایک اصطلاح سے دھوکا ہوگیا ہے کہ حضور ﷺ کے اندر شان قدم [1] کی ہے وہ یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ حقیقت محمدیہ قدیم ہے اس سے دھوکا ہوتا ہے کہ حضور ﷺ کے اندر شان قدم کی ہے حالانکہ یہ ان کی ایک اصطلاح ہے حقیقت محمدیہ سے مراد وہ علم الہی کا ایک مرتبہ لیتے ہیں اور اس کو حضور ﷺ کی طرف اس لیے نسبت کرتے ہیں کہ شان الہی حضور ﷺ کی مربی [2] ہے اور حضور ﷺ اس شان الہی کے مظہر [3] ہیں۔ حقیقت تو اس کو اس لیے کہتے ہیں کہ وہ ایک امر باطن ہے اور حضور ﷺ چونکہ اس شان سے فیضیاب ہوتے ہیں اس لیے اس کو آپ کی طرف منسوب کرتے ہیں

منشا دھوکہ کا یہ ہوا کہ حقیقت کے معنی وہ لے لیے جو منطقیوں نے لیے ہیں حالانکہ ان کی مراد یہ معنیٰ نہیں معقول کی جدا اصطلاح ہے اور تصوف کی علیحدہ اس التباس [4] کی وجہ سے یہ سمجھ گئے کہ جناب رسول اللہ ﷺ قدیم ہیں۔ یادرکھو کہ حضور ﷺ بجمیع اجزائے شریفہ حادث [5] ہیں۔ پس عرفی کا یہ شعر قرآن شریف کے بارہ میں تو بہت مناسب ہے۔

تجلی کلامی

الحاصل اگر کلام الہی کو یہ لباس حدوث کا نہ پہنایا جاتا تو یہ حالت ہوتی۔ لو

---

(۱) ہمیشگی کی ہے (۲) اللہ کی یہ شان حضور ﷺ کی تربیت کرنے والی ہے (۳) حضور ﷺ اللہ پاک کی اس شان کے ظاہر کو ذریعہ ہیں (۴) اصطلاحوں کے آپس میں ملنے کی وجہ سے دھوکہ ہوا (۵) حضور اکرم ﷺ اپنے تمام متبرک اجزاء کے ساتھ حادث ہیں کہ پہلے نہیں تھے بعد میں خود پیدا ہوئے

انزلنا ھذا القرآن علی جبل لرائیتہ خاشعا متصدعاً من خشیۃ اللہ [۱]۔ یعنی اگر ہم اس قرآن کو کسی پہاڑ پر نازل کرتے تو اے مخاطب تو اس کو اللہ کے خوف سے دب جانے والا اور پھٹ جانے والا دیکھتا۔ کوہ طور پر ایک ہی تجلی تو ہوئی تھی جس نے اس کو ریزہ ریزہ کر دیا تھا۔ موسیٰ علیہ السلام نے اوس رؤیت [۲] کی درخواست کی تھی۔ جس کے جواب میں ارشاد ہوا۔ ولکن انظر الی الجبل فان استقر مکانہ فسوف ترانی [۳]۔ یعنی تم مجھ کو نہیں دیکھ سکتے اس پہاڑ کی طرف دیکھو اگر یہ اپنی جگہ پر جما رہا تو تم مجھ کو دیکھ لو گے۔ فلماتجلی ربہ للجبل جعلہ دکا وخر موسی صعقا [۴]۔ یعنی رب موسیٰ علیہ السلام نے پہاڑ پر تجلی فرمائی تو اس کو ریزہ ریزہ کر دیا اور بیہوش ہو کر گر گئے۔ پس یہی حال تجلی کلامی کا بھی ہوتا کہ کسی کو اس کی تاب نہ ہوتی۔ حدیث شریف میں ہے لو کشف سجات وجھہ لاخترق ما انتھی الیہ بصرہ [۵]۔ پس نہایت رحمت ہے کہ اپنے کلام کو ایسی صورت سے اس عالم میں اتارا کہ ہمارے قلوب اس کے متحمل ہو گئے [۶] تو لازم تو یہ تھا کہ اس کا احسان مانیں نہ کہ الٹا اعتراض کریں۔ غرض انبیاء اور اولیاء اللہ کا کلام تنزل [۷] کے بعد بھی نہایت رفیع الشان ہوتا ہے وہ کلام سہل ممتنع [۸] ہوتا ہے۔ اس کے اندر ایسی رعایت اور پہلو ہوتے ہیں کہ نہایت مفید اور نہایت مفید ہونے کے ساتھ نہایت عالی کہ ارسطو اور افلاطون اور مشائیین اور اشراقیین بھی وہاں

---

(۱) سورۃ الحشر آیت ۲۱ (۲) موسیٰ علیہ السلام نے پہلے دیدار الٰہی کی درخواست کی تھی (۳) سورۃ الاعراف آیت ۱۴۳ (۴) سورۃ الاعراف آیت ۱۴۳ (۵) گر وہ اپنے چہرے کے حجابات کو اٹھا دے جہاں تک اس کی نظر پہنچے وہ سب جل جائے (۶) ہمارے دل اس کو برداشت کرنے کے قابل ہو گئے (۷) نچلے درجہ میں آکر بیان کرنے کے باوجود (۸) آسان بھی ہوتا ہے اور علوشان کیوجہ سے عام لوگوں کی دسترس سے باہر ہوتا ہے

تک نہیں پہنچ سکتے۔ پس اس پر اعتراض کرنا نری حماقت ہے اور عقل پرستی نہیں بلکہ وہم پرستی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ ان عقلاء کی عقل نے راہ ماری ہے اور **فرحوا بما عندهم**[1] کے پورے مصداق ہیں۔

مانع حق طبیعت

دوسری شے حق سے روکنے والی طبیعت ہے طبیعت کا مقتضیٰ یہ ہے کہ تمام شہوات اور لذات سے تمتع[2] حاصل ہو اور سب پر غالب ہو کر رہوں سب میرے ماتحت ہوں بعضوں کو تو اس تسخیر[3] کا یہاں تک خبط ہوتا ہے کہ آدمیوں کو چھوڑ کر چاہتے ہیں کہ جنات بھی ہمارے تابع ہو جائیں میرے پاس بہت خطوط آتے ہیں کہ کوئی عمل تسخیر کا بتلادو مجھے بھی ایک مرتبہ زمانہ طالب علمی میں تسخیر جن کا خبط[4] ہوا تھا میں نے حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ سے عرض کیا تھا۔ کہ حضرت کوئی عمل تسخیر جن کا بتلا دیجیے حضرت نے فرمایا کہ ہاں ایسے عمل ہیں مگر یہ تو بتلاؤ کہ کیا حق تعالیٰ نے تم کو اسی واسطے پیدا کیا ہے کہ تم خدا بنو تم کو حق تعالیٰ نے بندہ بننے کے لیے پیدا کیا ہے۔ بندہ بنو۔

زخاک آفریدت خداوند پاک پس اے بندہ افتادگی کن چو خاک[5]

مولانا محمد قاسم نانوتویؒ فرمایا کرتے تھے کہ مجھ پر یہ چند حرفوں کی تہمت لگ[6] گئی ہے ورنہ اپنے کو ایسا مٹاتا کہ کوئی نام بھی نہ جانتا ایک مرتبہ حضرت

---

(۱) جو کچھ ان کے پاس ہے اسی پر خوش ہیں (۲) تمام شہوتوں اور لذتوں سے فائدہ اٹھایا جائے (۳) دوسرے کو اپنے تابع کرنے کا (۴) جن کو تابع کرنے کا شدید خیال پیدا ہوا تھا (۵) خدا نے تجھے خاک سے پیدا کیا ہے پس اے بندے اپنی بڑائی پر خاک ڈال (۶) یعنی علم دین پڑھ کر عالم بنے اور لوگوں کو مسائل بتانا ضروری ہو گیا

مولانا تھانہ بھون تشریف لائے تھے وعظ بھی فرمایا تھا مجھ کو یاد ہے کہ حضرت چار پائی پر پائنتی کی طرف بیٹھے ہوئے تھے اور انگرکھ کے بند اور گھنڈی کھلی[1] ہوئی تھی۔ اللہ اکبر اس قدر مٹایا کہ کوئی پہچان ہی نہ سکتا تھا سنا تھا کہ مولانا محمد مظہر صاحبؒ کے پاس نائی خط بنانے آیا حضرت اس وقت چار پائی کی پائنتی کی طرف بیٹھے ہوئے تھے نائی کو حکم ہوا کہ سرہانے بیٹھ جا۔ اس نے کہا حضور میری کیا مجال ہے تیزی سے کہا ارے بیٹھ بھی۔ ان حضرات نے اپنے آپ کو کیسا مٹایا تھا۔ مگر اس مٹانے کے ساتھ مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کی اور شان بھی تھی وہ یہ جانتے تھے کہ چھوٹوں کے سامنے تواضع کرنے سے ان کو تکلیف ہوتی ہے اس لیے وہ زیادہ تواضع نہ فرماتے تھے۔ شاگردوں کو ان کا نام لے کر پکارتے تھے۔ مجھے فرمایا کرتے تھے اشرف علی خدا جانتا ہے کہ مولانا کے اس طرح پکارنے سے اس قدر جی خوش ہوتا تھا۔ کہ اوروں کے مولانا صاحب کہنے میں وہ لطف نہیں آتا۔ اور مولانا محمد قاسم صاحبؒ کا مذاق جدا تھا۔ وہ شاگردوں کو بھی مولوی صاحب اور شاہ صاحب کہہ کر پکارتے تھے بات یہ ہے۔ع

ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است[2]۔

بگوش گل چہ سخن گفتہ کہ خنداں است

بعندلیب چہ فرمودہ کہ نالاں است[3]۔

مختلف شانیں ہیں۔ کسی پر تواضع غالب ہے کسی پر شفقت و رحمت کا غلبہ ہے کسی کے اندر جلال کسی میں جمال کی شان ہے بعض لوگ جو بزرگوں پر اعتراض کیا کرتے ہیں کہ فلاں نرم ہیں اور فلاں تیز ہیں یہ نری جہالت ہے۔ تم

---

(۱) جو کرتا پہنا ہوا تھا اس کے بٹن کھلے ہوئے تھے (۲) ہر پھول کا رنگ اور اس کی خوشبو جدا ہے (۳) بھول کے کان میں کیا بات کہہ دی کہ مسکرا رہا ہے جس سے کیا فرمایا کہ فریاد کر رہی ہے

کوان کے حال کی کیا خبر ہے تم ہر ایک کو اپنے اوپر قیاس[1] کرتے ہو۔ تمہارے لیے یہی بہتر ہے کہ تم اپنی حالت پر رہو۔ بزرگوں کا فیصلہ کرنے والے تم کون ہوتے ہو۔ گیدڑ اگر شیروں کا فیصلہ کرے تو اس کی کم بختی آتی ہے تم اپنی خیر مناؤ۔ ایسا نہ ہو کہ ان کے درمیان میں تم نہ دلے جاؤ[2]۔

آرزو میخواہ لیک اندازہ خواہ　　　برنہ تابد کوہ را ایک برگ کاہ

حاصل مجاہدہ

غرض مانع عن الحق دو شئی ہیں[3] عقل اور طبیعت۔ عقل خواص کی راہزن[4] ہیں اور طبیعت سب کی۔ پس مجاہدہ کا حاصل یہ ہوا کہ عقل اور طبیعت دونوں کو مغلوب کیا جائے پس دو قسم کے عمل کی ضرورت ہے۔ ایک تو وہ عمل کہ جس پر عقلیت غالب ہو مثلاً نماز ہے کہ اس سے مقصود جاہ کو مغلوب[5] کرنا۔ اور جناب باری کے سامنے نیازمندی[6] کا اظہار ہے تو عقل بھی نیاز مندی اور نماز میں مناسبت سمجھتی ہے اس لیے کہ اس میں دست بستہ ہاتھ باندھ کر کھڑے ہوتے ہیں اور اشرف اجزاء[7] یعنی سر کو ارذل العناصر[8] یعنی زمین پر رکھا جاتا ہے غرض اس کے ہر ہر جزو سے اس کی غایت سمجھی جاتی ہے۔ اسی طرح روزہ کو سمجھیے کہ وہ قوت بہیمہ کے انکسار[9] کے لیے ہے اور مناسبت دونوں میں سمجھ میں آتی ہے۔ پس ان دونوں عبادتوں میں عقلیت کی شان غالب ہے ان کے اد

---

(۱) ہر ایک کو اپنا جیسا سمجھتے ہو (۲) پس جاؤ (۳) الغرض حق سے روکنے والی دو چیزیں ہیں (۴) عقل خاص لوگوں کے لیے رکاوٹ کا باعث ہے (۵) اقتدار طلبی (۶) عاجزی (۷) اعضائے انسانی میں سب سے اعلیٰ جز (۸) عناصر اربعہ آگ پانی مٹی ہوا میں سے جو سب سے کم نیچے درجہ کا عنصر ہے یعنی زمین (۹) حیوانی قوت کو کمزور کرنے کے لیے

کرنے سے عقل کی رعایت ہے اور دوسری قسم عمل کی وہ ہونا چاہیے کہ جس میں عقلیت کی شان مغلوب ہو۔ عقل براہ راست اس کو نہ سمجھے۔ بلکہ اس میں طبیعت کا غلبہ ہو اور اس کے ادا کرنے میں طبیعت کی رعایت ہو۔ جب عقل اور طبیعت دونوں کی رعایت کرکے دونوں کو کام میں لگا دیا جائے تو دونوں کو حق تعالیٰ سے تعلق ہو کر ان میں شان انقیاد[1] کی آجاوے گی اور دونوں اعتدال پر آجاویں گے اور یہی دونوں چیزیں حق سے روکنے والی تھیں تو اس وقت بندہ پر حق واضح ہوجاوے گا۔ اور مجاہدہ بھی کامل ہوجائیگا۔

رعایت طبیعت

اس سے سمجھ میں آگیا ہوگا کہ جیسے ہم کو پہلی قسم کی ضرورت ہے اسی طرح دوسری قسم کی بھی ضرورت ہے اس لیے ہم کو اس میں سے بھی حصہ دیا گیا ہے۔ اور صرف عقل کو رام کرلینا کافی نہ تھا۔ اس لیے کہ طبیعت اس کی مزاحم[2] ہوتی رہے گی اور عقل اور طبع میں جب تنازع ہوتا ہے تو غلبہ ہمیشہ طبع کو رہتا ہے۔ اور وجہ اس کی یہ ہے کہ طبع پر وہم کا اثر غالب رہتا ہے دیکھو اگر بڑی اونچی دیوار ہو اور ایک گز اس کا عرض[3] اور ادھر ادھر کوئی آڑ[4] اس پر نہ ہو اور وہاں پر کسی آدمی کو چھوڑ دیا جاوے تو سوائے نٹ[5] کے کوئی اس پر کو نہ گزر سکے گا۔ بلکہ گذرنا تو علیحدہ وہاں بیٹھ نہ سکے گا۔ حالانکہ عقل کہتی ہے کہ چلنے کے لیے تو صرف ہاتھ بھر[6] بلکہ اس سے کم جگہ کافی ہے اور عقل برابر زبان حال سے کہہ رہی ہے کہ گروگے نہیں۔ مگر وہم کہتا ہے کہ ضرور گروگے اور اسی کا غلبہ رہتا ہے۔

---

(۱) تعبدادی کی شان (۲) طبیعت اس سے جھگڑتی رہتی (۳) چوڑائی (۴) رکاوٹ (۵) ہاوے (۶) صرف ایک ہاتھ چوڑی جگہ

بعض فلاسفہ کہتے ہیں کہ بہت اونچی دیوار پر جو انسان ڈرتا ہے۔ اور بسا اوقات[۱] گر بھی جاتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر شئے کا مرکز کی طرف میلان[۲] ہے۔ مرکز یعنی زمین اس کو کشش کرتی ہے۔ اس لیے ڈرتا ہے۔ یہ بالکل بے ہودہ بات ہے اس لیے کہ اگر کسی اندھے کو وہاں چھوڑ دو اور یقین دلادو کہ حافظ جی اس کے دونوں طرف دیواروں کی آڑ ہے گرو گے نہیں تو ہرگز اس کو خوف[۳] نہ ہوگا۔ اور جب اس کو بھی علم ہوجاویگا تو وہ بھی خائف ہوگا۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہم کے غلبہ سے خوف معلوم ہوتا ہے۔

دیکھو ننھے بچے ایسی ایسی جگہ پہنچ جاتے ہیں کہ بڑے وہاں نہیں جاسکتے۔ اس لیے کہ ان کو ہوش نہیں اور وہم پرستی سے ان کا دماغ خالی ہے ان کو زمین کیوں نہیں کشش کرتی۔ یہ سب ڈھکوسلے ہیں۔ اسی طرح پتھر جو اوپر سے نیچے کو آتا ہے تو حکماء قدیم تو یہ کہتے ہیں کہ پتھر کے اندر نیچے جانے کا میلان ہے اور اس وقت کے فلاسفہ کہتے ہیں کہ زمین اس کو اپنی طرف کشش کرتی ہے یہ سب گپ ہے ہاں پہلی بات کچھ جی کو لگتی ہے قرآن شریف سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ ارشاد ہے۔

ان اللہ یمسک السموات والارض ان تزولا ط ولئن زالتا ان امسکھما من احد من بعد[۴].

اور ارشاد ہے۔ و یمسک السماء ان تقع علی الارض[۵]

- ان دونوں آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آسمان زمین پر گرنا چاہتا ہے مگر حق تعالیٰ اسے روکے ہوئے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر شئے مرکز کی طالب ہے۔

الحاصل طبع پر وہم کا غلبہ رہتا ہے پس اگر مجاہدہ کے اندر صرف عقل کی

---

(۱) اکثر و بیشتر (۲) جھکاؤ (۳) اور نہ گرے گا (۴) سورۃ فاطر آیت ۴۱ (۵) سورۃ الحج آیت ۶۵

تعدیل کی جاتی اور طبع کو مہمل چھوڑ [1] دیا جاتا۔ تو سخت مصیبت ہوجاتی۔ مثلاً نماز کا وقت آیا تو عقل کہتی ہے کہ نماز پڑھنا چاہیئے اور طبع پر سستی غالب ہوئی اور پہلے گذر چکا ہے کہ عقل اور طبع کی مزاحمت کے وقت طبع کو غلبہ رہتا ہے۔ پس اس صورت میں بھی طبع کو غلبہ رہتا۔ پس اس کا ضروری اور لازمی اثر تھا کہ نماز ترک ہوتی۔ حق تعالیٰ کا یہ فضل ہوا کہ طبع کو بھی رنگین بنادیا۔ اور اس کو خاص خاص مجاہدوں سے مہذب بنادیا اب خود اس کا اقتضاء ہے کہ وہ اٹھا کر کھڑا کردیتی ہے اسی واسطے منتہا مجاہدہ کا یہ ہے کہ امور شرعیہ امور طبعیہ [2] بن جاویں اسی کی نسبت کسی نے کہا ہے۔

صنمارہ قلندر سزداربمن نمائی ۔۔۔ کہ دراز ودور دیدم رہ ورسم پارسائی [3]

رہ قلندر سے یہی مراد ہے کہ طبع پر رنگ چڑھ جاوے کہ بدوں اس کے چین نہ آوے بفضلہ تعالیٰ اس رنگ کا حصہ کم وبیش دینداروں میں موجود ہے۔

اختلاف طبیعت

دیکھو اگر کسی نمازی کو نماز کے وقت دو آدمی پکڑ کر رسے باندھ دیں تو وہ رسے توڑ کر بھاگے گا۔ تو اس میں کیا راز ہے یہی ہے کہ اس کی طبیعت بدل گئی ہے وہ کشاں کشاں [4] اس کو اپنے مقتضیٰ کی طرف لے جاتی ہے۔ اس کو ملکہ راسخہ اور طبیعت ثانیہ کہتے ہیں۔

کسی بزرگ نے حکایت لکھی ہے کہ ایک آقا اور غلام چلے جارہے تھے۔ غلام

---

(۱) اگر صرف عقل کی رعایت کی جاتی اور طبیعت کو بے کار چھوڑ دیا جاتا (۲) مجاہدے کی انتہاء یہ ہے کہ شرعی احکام پر آدمی ایسے عمل کرے جیسے طبعی تقاضوں پر کیا کرتا ہے (۳) مجھے قلندری کی ایسی راہ دکھا جو میرے مناسب ہو اس لیے کہ میں پارسائی کی قیدوں کو دور دراز پاتا ہوں (۴) آہستہ آہستہ

نمازی تھا نماز کا وقت آگیا وہ مسجد میں نماز پڑھنے گیا اور آقا صاحب مسجد سے باہر رہے۔ جب بہت دیر ہو گئی تو آقا نے پکارا کہ آؤ۔ غلام نے کہا کہ آنے نہیں دیتا۔ فرق کیا تھا کہ نمازی اس غلام کی طبیعت تہذیب ہو گئی تھی۔ اور مولیٰ کی طبیعت مہذب نہ تھی[1]۔

اس کی وہ حالت تھی جیسے کسی قصائی کا بیل چھٹ کر مسجد میں گھس گیا۔ لوگوں نے ملامت کی تو کہنے لگا کہ میاں جانور بے عقل تھا۔ چلا آیا۔ کبھی ہم کو بھی دیکھا ہے اللہ اکبر طبیعت کا کیسا اختلاف ہے اور یہی طبیعت کبھی ایسا پلٹا کھاتی ہے کہ تکبیر اولیٰ بھی اگر فوت ہو جائے تو گویا غم کا پہاڑ آگرتا ہے۔

بر دل سالک ہزاراں غم بود　　گر ز باغ دل خلالے کم بود[2]

اس لیے بہت زیادہ ضروری طبیعت کو مسخر[3] کرنا ہے۔

طبیعت اور عقل کی مثال

طبیعت اور عقل کی مثال ریل کی سی ہے کہ انجن میں جو کلیں[4] ہیں ان کے ذریعے سے پہیے کو گھما کر بھی چلا سکتے ہیں لیکن سخت تکلیف ہوگی اور کچھ دور جا کر یقیناً رک جائیگی اور زیادہ مسافت قطع نہ کر سکے گی[5]۔ یہ مثال تو عقل کی ہے کہ عقل کے ذریعہ سے گو بدن سے کام لے سکتے ہیں لیکن بہت کم اور بڑی مشقت سے اور اگر اس میں آگ اور پانی بھی اور اس کے بعد کلوں کو گھما یا جاوے تو پھر اس

---

(۱) اس قصہ کا حاصل یہ ہے کہ آقا نے کہا کون نہیں آنے دیتا جواب دیا کہ جو تجھے اندر آنے نہیں دیتا مجھے باہر آنے نہیں دیتا (تیری طبیعت کا تقاضا تجھے باہر رہنے کا ہوا اور میری طبیعت کا تقاضا اندر رہنے کا ہوا) ۱۲ (۲) سالک کے دل پر ہزاروں غم چھا جاتے ہیں اگر اس کے دل کے باغ سے ایک تنکا بھی کم ہو جائے (۳) طبیعت کو تابع کرنا بہت ضروری ہے (۴) پرزے (۵) زیادہ مسافت طے نہ کر سکیں گی

سے بے تکلف ہزاروں میل قطع[1] ہو سکتے ہیں - یہ مثال طبیعت کی ہے کہ اگر طبیعت رنگین ہوجائے تو اس سے بڑے بڑے کام بے تکلف لے سکتے ہیں - پس ایسے مجاہدوں کی بھی ضرورت واقع ہوئی کہ جن سے طبع مسخر[2] ہو -

حج سے تسخیر طبیعت

ان میں سے ایک بہت بڑی شے[3] حج بھی ہے اور اس میں یہ رنگ ہونا اس آیت سے سمجھ میں آیا ہے چنانچہ ارشاد ہے کہ واسطے اللہ کے لوگوں پر خانہ کعبہ کا حج ہے جو اس تک راہ کی مقدور رکھتے ہیں ۔

اس آیت میں جو لفظ حج البیت واقع ہوا ہے تو اس اضافت سے اس کا پتہ چلتا ہے اللہ اکبر قرآن شریف کا ایک ایک حرف ایک علم کا دریا ہے دیکھو اس اضافت سے کتنا بڑا علم مستنبط[5] ہوتا ہے تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ عقل اور طبیعت کے مشرب میں تفاوت[6] ہے - عقل کا مقتضی یہ ہے[7] کہ نفس عبادت کا اہتمام ہو اور قیود اور ہیئات کا اہتمام بالکل[8] نہ ہو اس لیے کہ عقل تجرد[9] کو چاہتی ہے اور تعینات اور تشخصات سے اس کو تنفر[10] ہے اور طبیعت چونکہ محسوسات سے مالوف[11] ہے اس لیے اس کو قیود اور ہیئات و تعینات سے انس[12] ہے اور جس شخص میں تجرد ہو اس کو الفت و انس نہیں ہے مثلاً نماز ہے اس کی روح خشوع و خضوع ہے تو عقل محض اس معنیٰ سے

(۱) ہزاروں میل کو سفر طے ہو سکتا ہے (۲) طبیعت کو تابع بنا یا جائے (۳) چیز (۴) سورۃ (۵) نکلتا ہے (۶) فرق (۷) عقل اس بات کا تقاضا کرتی ہے (۸) کوئی قید اور کوئی خاص شکل نہ ہو (۹) ایسے میں (۱۰) وقت کو متعین کرنا اور خاص طریقہ ہوا کرنا اس کو پسند نہیں (۱۱) طبیعت چونکہ حسیات سے مانوس ہے (۱۲) اس لیے اس کو پسند ہے کہ وقت کا تعین بھی ہو اور اس میں قیود بھی ہوں اور اس کی خاص شکل بھی ہو

آشنا ہے اور جو قیود اس کے علاوہ ہیں وہ دو قسم ہیں ایک تو وہ ہیں جو نماز کے مقام اور محقق ہیں جیسے رکوع اور سجدہ عقل کو ان سے بھی گریز[1] نہیں۔ اس لیے کہ یہ سب خشوع اور خضوع کی صورتیں ہیں اور اسی طہارت کی قید سے بھی اس کو انکار نہیں اور دوسری قسم قیود کی وہ ہیں جو زائد اور خارج ہیں جیسے مکان خاص یا زمان خاص عقل اس قسم کی قیود کو تجویز نہیں کرتی ایسے قیود طبیعت کا حظ[2] ہیں۔ اسی واسطے میں نے کہا تھا کہ نماز کے اندر عقلیت کی شان کا غلبہ ہے اور طبیعت مغلوب ہے پس عقل ایسی عبادت کی مجوز[3] ہے جو زمان اور مکان کی قید سے مبرا[4] ہے جیسے ذکراللہ کہ کسی وقت کے ساتھ مقید نہیں۔ چنانچہ ارشاد ہے یذکرون اللہ قیاما وقعودا[5] اور حدیث میں کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یذکراللہ فی کل حین[6] لیکن طبیعت کی رعایت کرکے بعض عبادتوں میں قیدیں لگائی گئی ہیں اس لیے کہ طبیعت کا تعلق جزئیات محسوسہ سے ہے اور اس کا مقتضیٰ یہ ہے کہ ہر قسم کی قید ہو پس جو عبادات عقل کی تسخیر کے لیے ہیں ان میں قیدیں نہ ہونی چاہئیے اور طبیعت کی تسخیر کے لیے ہیں ان میں قیود ہونا ضروری ہیں اس لیے ہر قسم کی عبادتیں حق تعالیٰ نے مقرر فرمائی ہیں۔

اقسام قیود

اس کے بعد سمجھنا چاہئیے کہ قیود کی تین قسمیں ہیں۔ اول قید زمان۔ دوسرے قید مکان تیسرے علاوہ ان دونوں کے کوئی قید مناسب ہو۔ ان تینوں قسموں کے درمیان جو غور کرکے دیکھا جاتا ہے تو زمان[7] کی قید عقل سے اتنی

---

(۱) احتراز (۲) حصہ (۳) عقل ایسی عبادت تجویز کرتی ہے (۴) جو زمانے اور جگہ کی قید سے خالی ہو (۵) وہ اللہ کو کھڑے اور بیٹھے یاد کرتے ہیں (۶) رسول اللہ ﷺ اللہ کا ذکر ہر وقت فرماتے تھے (۷) زمانے یعنی وقت کی قید

بعید[1] نہیں ہے جس قدر کہ مکان کی قید بعید[2] ہے اس لیے کہ زمان بھی ہر چند کہ قید ہے لیکن وہ ایسی قید ہے کہ اطلاق کے مناسب ہے اس لیے کہ زمان خود ایک ایسی شئے ہے کہ اس کے اندر ایک قسم کا اطلاق ہے خواہ فلاسفہ کے قول کے موافق فلک الافلاک کی حرکت کو کہا جائے یا متکلمین کے قول کے موافق ایک امتداد موہوم سے تعبیر کیا جاوے ہر صورت میں زمانہ ایک ایسی شے ہے کہ اس میں اطلاق کی مشابہت ہے پس اس قید سے بھی عقل کو زیادہ انکار نہیں ہے۔ باقی رہی قید مکان کی یا وہ قید جو محسوس ہونے میں مکان کی طرح ہو اس سے عقل کو بالکلیہ انکار ہے وہ خاص طبع کے موافق ہے پس حج چونکہ بیت کی طرف مضاف[3] ہے اور بیت نام ایک مکان خاص کا ہے اس لیے یہ عبادت طبع کی تسخیر کے لیے ہوئی اور عقل اس کو بالکل تجویز نہیں کرتی ہے۔

مجاہدہ حج

چنانچہ حج کو اول سے آخر تک دیکھ لیجیے کہ اس کے سب افعال ایسے ہی ہیں۔ دیکھیے سب سے پہلے حج میں کیا ہوتا ہے۔ سب سے اول یہ ہوتا ہے کہ اپنے گھر آرام سے اپنے اہل و عیال اور عزیزوں میں بیٹھے ہوئے ہیں دل میں آیا کہ حج کریں۔ سفر کی تیاری ہوئی عقل یہاں سے ہی مانع[4] ہوتی ہے کہ کیا ضرورت ہے۔ خصوصاً جبکہ عقل نے یہ اشعار بھی سن لیے ہیں۔

اے قوم بحج رفتہ کجائید کجائید — معشوق دریں جاست بیائید بیائید[5]

(۱) عقل کے اتنا خلاف نہیں ہے (۲) جس قدر کے مکان کی قید، عقل سے دور ہے (۳) منسوب کیا جاتا ہے حج بیت اللہ (۴) رکاوٹ بنتی ہے (۵) اے حج کو جانے والی قوم کہاں جا رہے ہو کہاں جا رہے ہو آؤ آؤ محبوب تو اسی جگہ ہے

حالانکہ یہ شعر خاص ان لوگوں کے واسطے ہے جو حج کرکے خدا سے اور زیادہ دور ہوجاتے ہیں یعنی پاس کچھ نہیں ہے اور شوق ہوا حج کا چل دیے اور راستہ میں نمازیں قضا کر رہے ہیں اور لوگوں سے بھیک مانگ رہے ہیں ایسے لوگوں کو خطاب ہے کہ محبوب تو یہاں ہی ہے یعنی اس کی مرضی نہیں ہے کہ تم وہاں جاؤ اور مرضیات کے خلاف کرو غرض عقل اول ہی سے سدِ راہ[1] ہوتی ہے اور کہتی ہے کہ حضرت حق تو مقید مکان[2] کے ساتھ نہیں تم وہاں جاکر کیا کروگے۔ غرض عقل کو سخت گنجلک[3] ہوتی ہے۔

یہاں سے یہ بات بھی سمجھ میں آگئی ہوگی کہ آج کل جو بعض عقل پرست حج پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ عقل کے خلاف ہے اس امر کو ہم تسلیم کرتے ہیں اور اسی کو ہم ثابت کرتے ہیں کہ واقعی عقل کے خلاف ہے مگر یہ ضرور نہیں کہ عقل جس بات کو تجویز نہ کرے وہ ضروری نہیں ہے یہ عبادت، طبع کی تسخیر[4] کے لیے ہے اور اس کا تسخیر کرنا ضروری ہے کما مر۔

اب آگے چلیے آگے یہ ہوتا ہے کہ اچھے خاصے آدمیوں کی صورت سے نکل کر یہ وحشت ہوئی کہ سب کپڑے اتار دیے صرف ایک لنگی باندھ لی اور ایک چادر بدن پر اوڑھ لی اور سر ننگا کرلیا۔ یہاں بھی عقل کو وحشت ہوئی کہ بائیں یہ کیا ہوا۔ یہ کون سی عقل کی بات ہے کہ ننگے سر رہو اور اچھے خاصے کپڑے اتار کر مردوں کا سا کفن بدن سے لپیٹ لیا۔

اس کے بعد دو رکعت پڑھ کر چلانا شروع کیا لبیک اللھم لبیک[5]۔ ب

---

(۱) راستہ کی رکاوٹ ہے (۲) اللہ کی ذات کو کسی جگہ میں مقید نہیں، کہ وہاں ہو یہاں نہ ہو وہ ہر جگہ ہے (۳) پریشانی (۴) یہ عبادت طبیعت کو حکم الٰہی کا تابع بنانے کے لیے فرض کی گئی ہے (۵) اے اللہ میں حاضر ہوں

عقل پھر روکتی ہے کہ یہاں چلاتے کیوں ہو یہ تم کو کیا سودا ہوا۔ لیکن وہ ایک نہیں سنتا۔ اس کے بعد آگے چلے جب خانہ کعبہ پہنچے اور اس کو دیکھا تو آنکھ سے ٹپ ٹپ آنسو جاری ہوگئے عقل کہتی ہے کہ باؤلے کیوں ہوگئے روتے کیوں ہو؟ آگے بڑھے تو کیا سوجھی کہ دیوانوں کی طرح ایک مکان کے چاروں طرف پھر رہے ہیں اور پھر یہ حرکت کہ آپ دوڑتے ہیں اور شانے[1] ہلاتے جاتے ہیں۔ عقل کہتی ہے کہ بس جی بالکل ہی دیوانگی آگئی ور وہ جواب دیتا ہے۔

"ما اگر قلاش و گر دیوانہ ایم　　　مست آں ساقی و آں پیمانہ ایم

اوست دیوانہ کہ دیوانہ نہ شد　　　مرعسس را دید و در خانہ نشد"[2]

غرض عقل وہاں ٹکڑسی، لبی[3] کھڑی تکتی ہے اور کچھ نہیں کرسکتی۔ اس بھلی مانس سے کوئی پوچھے کہ تو یہاں آئی کیوں۔ اس کو مناسب تھا کہ یہ یہاں نہ آتی۔ لیکن طبیعت سے پوچھو وہ باغ باغ[4] ہے اور عقل ملامت[5] کرتی ہے کہ تو یہاں کیوں آئی یہاں تیری دعوت نہیں ہے یہاں تو ہماری دعوت ہے تو یہاں محض طفیلی ہے ایک طرف چپکی کھڑی رہ اگر ذرا دم مارا تو کان پکڑ کر نکال دیجائے گی۔ خیر عقل بے چاری چپ ہوگئی۔ اس نے اور صبر کیا خیر۔

وہاں سے پھر پھرا کر صفا مروہ کی طرف گئے وہاں کیا حرکت کی کہ اچھے خاصے متانت کے ساتھ چلتے چلتے میلین اخضرین کے درمیان ایکدم سے بھاگے عقل کو سخت وحشت ہوئی پھر ایک دفعہ نہیں سات مرتبہ یہی کیا۔ اس کے بعد خیر عقل نے مغلوب ہو کر تسلیم کرلیا کہ یہ اللہ میاں کا گھر ہے یہاں ایسے ہی افعال

---

(۱) یعنی طواف میں رمل کر رہے ہیں (۲) ہم اگر مفلس و دیوانہ ہوں تو ہیں اسی ساقی و پیمانے سے مست ہوں دیوانہ تو وہی ہے کہ جو دیوانہ نہ ہوتی کششوں کے دیکھنے کے باوجود گھر میں نہیں آتا (۳) لونڈی (۴) بہت خوش ہے (۵) برا بھلا کہتی ہے

مناسب ہیں اس کے بعد آٹھویں تاریخ جب آئی تو عرفات کو چلے عقل یہاں بھی روکتی ہے کہ میاں یہ کیا وحشت ہے۔ اللہ میاں کے گھر کو چھوڑ کر جنگل کیوں چڑھ گئے پھر وہاں کوئی شئے نہیں محض ایک میدان ہے اور وہاں جا کر کچھ کرنا بھی نہیں پڑتا۔ ایک نماز تھی جو عقل کا حظ تھا وہ بھی اپنے وقت پر نہیں ہے۔ یعنی عصر کی نماز اس روز ظہر کے وقت پڑھی جاتی ہے[1]۔ خیر عقل نے جوں توں کر کے تمام دن گذارا۔ اب مغرب کا وقت آیا۔ عقل کہتی ہے کہ نماز پڑھو لیکن نماز نہیں پڑھتے اس لیے کہ اس روز مغرب کی نماز مزدلفہ میں جا کر عشاء کے وقت میں پڑھی جاتی ہے مغرب کا وقت گذر رہا ہے اور عقل سخت پیچ و تاب[2] میں ہے کہ یہ کیا اسرار ہے کہ نماز بھی اڑ گئی عقل اس پارلیمنٹ سے بالکل علیحدہ ہے اس کے بعد منا میں پہنچے وہاں تین پتھر ہیں ان کو کنکریاں مارو یہاں بھی عقل منع کرتی رہی کہ یہ کیا دیوانگی ہے پھر جانور ذبح کرو۔ ذبح خود عقل کے خلاف نہ کہ اس شان کے ساتھ اس کے بعد سر منڈاؤ اچھے خاصے تھے سب کے سر کدو سے نکل آئے اور عورتوں کے لیے بجائے سر منڈانے کے تھوڑے سے بالوں کا کترانا ہے اس لیے کہ عورتوں کے سر کے بال مردوں کی داڑھیوں کے قائم مقام ہیں جیسے مردوں کی زینت داڑھی سے ہے عورتوں کی زینت سر کے بالوں سے ہے اس لیے حج اور غیر حج کسی وقت ان کا بالکل کتر ڈالنا یا مونڈنا جائز نہیں۔

اسی واسطے میں کہا کرتا ہوں کہ جو لوگ داڑھی منڈاتے ہیں ان کو چاہیئے کہ عورتوں کے سر کے بال منڈایا کریں۔ اس لیے اگر داڑھی کے منڈانے سے ان کے زعم میں زینت ہوتی ہے تو عورتوں کے سر کے بال منڈانے سے بھی ہونی چاہیئے۔

---

(۱) اس کو جمع تقدیم کہتے ہیں (۲) غصہ میں تلملا رہی ہے

غرض حج کے جس قدر افعال ہیں اول سے آخر تک سب عقل کے خلاف ہیں اس لیے کہ اس مجاہدہ میں عقل کی رعایت نہیں ہے طبیعت کے مذاق کے موافق ہے اس لیے کہ طبیعت قیود مکانیہ کو مقتضی ہے یہ تو اجمالی بیان تھا۔ حج میں رعایت طبیعت کا۔

خاصیت محبت

اور تفصیلی بیان یہ ہے کہ تتبع[1] سے یہ معلوم ہوا ہے کہ اصل میں طبع جس شے سے مغلوب ہوتی ہے وہ صرف ایک شے ہے جس کا نام محبت ہے محبت ہی وہ شے ہے جس سے طبیعت مغلوب ہوجاتی ہے اور اس کے سامنے بیکار ہوجاتی ہے۔ طبیعت کی کیفیت یہ تھی کہ وہ وہم کی مسخر[2] تھی۔ لیکن محبت کے سامنے سب اوہام جاتے رہتے ہیں۔ دیکھو اگر کوئی کسی مردار اور عورت پر عاشق ہوجاتا ہے تو ذلت اور خواری جو کہ طبیعت کے خلاف تھی سب گوارہ کرتا ہے اور اگر کبھی ان چیزوں کی مزاحمت ہوتی ہے تو کہتا ہے۔

من آنست کہ یاراں ہمہ کار بگذارند و خم گیسوے یارے گیرند[3]۔

طبیعت کہتی ہے کہ رسوا ہوجائیگا۔ محبت کہتی ہے۔

نسازد عشق را کنج سلامت خوشا رسوائی کوئے ملامت[4]

طبیعت چاہتی ہے کہ میری بڑائی و ننگ و ناموس محفوظ رہے لیکن محبت کا مقتضی یہ ہے۔

---

(۱) غور و فکر کرنے سے معلوم ہوا (۲) وہم کے تابع تھی (۳) میں تو وہ ہوں کہ جس نے دوستوں کے سب اکثر عادات سے صرف نظر کرلیا ہے اور اپنے محبوب کی زلفوں کا اسیر ہوگیا ہوں (۴) عشق کے واسطے گوشہ عافیت نہیں ہے اس کے لیے تو محبوب کی گلیوں کی رسوائی خوشی کا باعث ہے۔

شاد باش اے عشق خوش سودائے ما ۔۔۔ وے طبیعت جملہ علتہائے ما

اے دوائے نخوت و ناموس ما ۔۔۔ اے تو افلاطون و جالینوس ما[1]

اور واقعی طبیعت کو دبانے کے لیے بھی ایسی ہی سخت شے کی ضرورت تھی ۔ عقل کو تو اس نے دبالیا تھا۔ لیکن محبت جیسا زبردست پہلوان نہ ہوتا تو واقعی طبیعت عقل پر غالب آکر بہت فساد اٹھاتی۔ غرض محبت طبیعت سے مغلوب ہوتی ہے محبت کا بقاء اور ظہور ہوتا ہے اسباب سے اور اسباب اس کے یہ ہیں کہ محبوب کے ساتھ کچھ تلبس ہو مثلاً محبوب کو دیکھ لیا یا اس کی آواز کان میں آگئی یا اگر خوش قسمتی سے ہاتھ ملالیا تو محب ذبح ہی ہو جائے گا۔ اور اگر کبھی معانقہ نصیب ہو گیا تو یوں سمجھو سب کچھ مل گیا۔ اور اگر ان اسباب میں سے کوئی شے بھی نہ ہو تو محبت ضعیف تو یقیناً جاتی رہے گی اور محبت قوی بھی یا تو ضعیف ہو کر قریب الزوال ہو جائے گی اور یا محب کو لنا کر ڈالے گی۔

طریق اظہار محبت

پس جب محبت کا یہ خاصہ معلوم ہو گیا تو سمجھنا چاہیئے کہ یہاں محبوب ہیں اللہ تعالیٰ اور وہ بالکل نظروں سے غائب ہیں نہ ان کو دیکھ سکتے ہیں نہ کوئی آواز ان کو سنائی دیتی ہے اور ہاتھ ملانا اور معانقہ کرنا تو کیسے ہو سکتا ہے پس اگر اس محبت کی بقاء کا کوئی سبب ظاہری دنیا میں نہ بنایا جاتا تو محبین یا تو ہجر میں[2] فنا ہو جاتے یا محبت ان کی رخصت ہو جاتی اس لیے حق تعالیٰ نے اپنی رحمت بے نہایت سے

---

(۱) آفرین اے عشق کہ میں بہت دیوانگی پہ خوش ہوں کہ تو میری تمام بیماریوں کے لیے بمنزلہ طبیعت کے ہے تو میری بزرگی و عظمت کے لیے بمنزلہ دوا کے ہے اور تو میرے لیے افلاطون اور جالینوس کی طرح ایک معالج ہے (۲) فراق میں ہلاک ہو جاتے

دنیا میں ایک گھر بنایا۔ اور اس کو اپنی طرف منسوب فرما کر اس کا نام بیت اللہ رکھا۔ اور اس پر ایک خاص تجلی اپنی صفات کی رکھی اور اس میں ایک پتھر حجر اسود رکھا گیا جس کا نام یمین اللہ رکھا گیا اور اس کی زیارت مستطیعین[1] پر فرض کر دی کہ اپنی جان اور مال لے کر دار۔ محبوب تک جاؤ اس لیے کہ محبوب حقیقی کو اس عالم میں دیکھ نہیں سکتے اس لیے کہ تخت یعنی تجلی گاہ سے ہی اپنی محبت کا اظہار کرو اور اپنے جوش محبت کو نکال لو۔ اس کے گرد پھرو اس سے معانقہ کرو۔ اس سے مصافحہ کرو۔ یعنی حجر اسود کو تقبیل یا مَس کرو[2] اور عشاق کی سی صورت بناؤ اور جیسے عشاق کی چال اور افعال میں وقار اور متانت نہیں رہتا ایسے ہی تم بیت اللہ شریف کے گرد شانے ہلاتے ہوئے دوڑو اور اگر کوئی ان افعال سے مانع ہو اور ملامت[3] کرے تو اس کو پتھروں سے مارو یعنی رمی جمار کرو۔ اور چھوٹی چھوٹی کنکریاں اس لیے تجویز کی گئی ہیں کہ بڑے بڑے پتھر اگر ہوتے تو ان سے کسی آنے جانے والے کے چوٹ لگ جاتی اور مارنا مقصود ہے شیطان کو۔ اور اس کو درحقیقت مارنے والی شے اللہ تعالیٰ کا ذکر ہے اور یہ کنکریاں اس کی ظاہری علامت ہے۔

اب سمجھ میں آگیا ہوگا کہ حج کے افعال سب عقل کے خلاف ہی ہونا چاہیئے چنانچہ صورت بھی مجنونوں کی سی ہوجاتی ہے۔ سر ننگا۔ بال بڑھے ہوئے جوئیں چلتی ہوئی۔ نہ سر کا ہوش۔ نہ بدن کی خبر اور مناسب تو یہ تھا کہ وہاں اس حالت سے جا کر اپنی جان دے ڈالتے۔ لیکن یہ محبوب کی طرف سے رحمت ہے کہ انہوں نے بجائے تمہاری جان کے ایسی شئے کی جان کو قبول کرلیا کہ جو ان کی جنس قریب میں شریک ہے یعنی بکرا یا گائے یا اونٹ کی قربانی کا حکم دیا۔

فلاسفر قربانی پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ مال کے ضائع کرنے سے کیا فائدہ

---

(۱) جن کو مکہ تک جانے کی قدرت ہو (۲) حجر اسود کو بوسہ دو یا چھولو (۳) روکے اور برا بھلا کہے

ہے اس لیے کہ اس کا گوشت بھی نہیں کھایا جاتا۔ لیکن یہاں تو عقل کو بالائے طاق رکھدیا ہے اس کو تو یہ کہا جاتا ہے تو ایک طرف کھڑی رہ تیرا یہاں کام نہیں ہے یہاں تو طبیعت کو بلایا گیا ہے پس فلاسفہ کو بکنے دو یہ کیا جانیں کہ اس میں کیا لطف ہے۔ غرض یہ موقع جان دینے کا تھا۔ لیکن یہ رحمت ہے کہ بجائے تمہاری جان کے محبوب نے جانوروں کی جان قبول فرمائی۔

اور دیکھیے کہ محبوب کے مکان کی عظمت عاشق کے دل میں بے حد ہوتی ہے یہاں اس کی عظمت کو اس طرح ظاہر کیا گیا ہے کہ وہاں کے جانور کا شکار نہ کرو اور وہاں کی گھاس نہ کاٹو فلسفیانہ نظر سے تو یہ بھی سمجھ میں نہیں آتا۔ لیکن عاشق سے پوچھو کہ اس کو محبوب کی در و دیوار کو دیکھ کر کیا حالت ہوتی ہے۔

و من ویدنی حب الدیار لاھلھا
وللناس فیما یعشقون مذاھب

اور ایک شاعر کہتا ہے۔

تمتع من شمیم عرار نجد
فما بعد العشیۃ من عرار (جامع)

وہ عاشق ہی کیا ہوا جس نے محبوب کے مکان کی قدر نہ کی اور وہاں کے گل تو علیحدہ وہاں کے خار کو بھی نظر محبوبیت سے نہ دیکھا اور وہاں کے جانوروں کا شکار تو بہت بڑی خیانت ہے اس تقریر سے ظاہر ہو گیا ہوگا کہ حج کے تمام افعال میں محبت کا ظہور ہے۔ اسی واسطے اس کے تمام افعال عقلی سطح کے خلاف نظر آتے ہیں اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ یہ سبب ظاہر سبب ہے محبوب حقیقی کی محبت کے بڑھنے کا اور جب محبت بڑھے گی تو یہ شخص محب ہوگا اور رفتہ رفتہ محبوب بن جاتا ہے۔

حج سے ازدیاد محبت

گو حق تعالیٰ کی محبت اور عبد کی محبت میں اتنا فرق ہے کہ عبد کی محبت کا تو آثار سے شور و غل ہوجاتا ہے اور حق تعالیٰ کی محبت مثل حق تعالیٰ کے پوشیدہ ہوتی ہے۔

عشق معشوقاں نہاں ست و ستیر　　عشق عاشق باد و صد طبل و نفیر
لیکن عاشق عاشقاں تن رہ کند　　عشق معشوقاں خوش و فربہ کند
عشق من پیدا و معشو قم نہاں　　یار بیروں فتنہ او در جہاں[1]

اور حج سے محبت کا بڑھنا ایک ایسا امر ہے کہ ہر مسلمان اس کو سمجھتا ہے چنانچہ ہر شخص اپنے قلب میں بیت اللہ شریف کی طرف ایک کشش اور انجذاب محسوس کرتا ہے اور جو وہاں گئے ہیں ان سے پوچھ لو کہ کیا حالت ہوتی ہے کہ خانہ کعبہ کو دیکھتے ہی دل بے قابو ہوجاتا ہے۔ اور بالاضطرار[2] آنسوؤں کا مینہ[3] برسنے لگتا ہے اور یوں معلوم ہونے لگتا ہے کہ خانہ کعبہ پر ضرور کوئی جلوہ گر ہے ورنہ ایک تعمیر میں رولانے کا اثر کیا معنیٰ۔

چرخ کو کب یہ سلیقہ ہے ستمگاری میں　　کوئی معشوق ہے اس پردہ زنگاری میں

یہ ضروری بات ہے کہ حق تعالیٰ مقید بالمکان[4] نہیں ہے لیکن مکان کے ساتھ ایک بے کیف اتصال اور تعلق[5] ضرور ہے لیکن وہ اتصال ایسا نہیں کہ جس کی ہم کیفیت یا کمیت بتلا سکیں مولاناؒ اسی مضمون کے متعلق فرماتے ہیں۔

---

(۱) معشوق کا عشق پوشیدہ اور پیچ سے باہر ہے اور عاشق کا عشق سو نقاروں اور شور کے ساتھ ہوا کے درستی پر ہے عاشق کا عشق تن کو گھلاتا ہے اور معشوق کا عشق خوشی اور فربہی کا باعث ہے میرا عشق تو ظاہر ہے اور میرا معشوق پوشیدہ یار تو ظاہر ہے اور اس کا فتنہ پورے عالم میں ہے (۲) غیر اختیاری طور پر (۳) آنسوؤں کی بارش ہونے لگتی ہے (۴) اللہ تعالیٰ مکان میں قید نہیں ہے (۵) جو کسی کیفیت کے بغیر لگاؤ اور تعلق ضرور ہے

اتصالِ بے تکیف بے قیاس　　ہست رب الناس را باجانِ ناس[1]

اور مولاناؒ کعبہ کی نسبت فرماتے ہیں۔

کعبہ را ہر دم تجلی میفزود　　ایں ز اخلاصات ابراہیم بود[2]

اور یہ تجلیات اگر نہ ہوتیں تو اس میں کیا تھا۔ مثل دیگر امکنہ[3] کے وہ بھی ایک مکان تھا۔ پس حجاج در اصل حج البیت نہیں کرتے بلکہ حج رب البیت کرتے ہیں مولانا فرماتے ہیں۔

حج زیارت کردن خانہ بود　　حج رب البیت مردانہ بود[4]۔

یہ حج کے اسرار ہیں جو بزرگوں کے کلام سے اول کتاب اور سنت کے اشارات سے میں نے بیان کیے ہیں۔

خاصیت حج

خلاصہ یہ ہے کہ اس سے حفاظت مقصود ہے مذاق محبت کا اور ثمرہ بھی اس کا وہی ہے جو عشق و محبت کا ثمرہ ہونا چاہیئے۔ چنانچہ حدیث میں آیا ہے کہ حج مبرور سے تمام گناہ بخشے جاتے ہیں عشق کا خاصہ یہی ہے کہ اس سے ماسوا محبوب کے سب فنا[5] ہوجاتے ہیں۔ عشق کی مثال آگ جیسی ہے کھیت میں اگر جھڑ جھنکار ہوں تو ایک ایک کو اکھاڑا جاوے تو بہت مدت صرف ہوگی۔ اور اگر آگ لگادو تو ایک دم سے سب جل بھن کر خاک سیاہ ہوجائیں گے۔ یہی حال آتش عشق کا ہے

(۱) اللہ کے لوگوں کے ساتھ ہونے کی کیفیت کو نہ بیان کیا جاسکتا ہے نہ کسی پر قیاس اتنی بات ہے کہ لوگوں کا رب ان کی جانوں کے ساتھ ہے (۲) کعبہ اللہ کی تجلیات ہر دم بڑھتی جارہی تھیں یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اخلاص کی وجہ سے ہے (۳) دوسرے مکانوں کی طرح (۴) حج خانہ کعبہ کی زیارت کرنے کا نام ہے مردانہ حج اصل میں رب البیت کی زیارت کا نام ہے (۵) محبوب کے علاوہ سب ختم ہوجاتا ہے

کہ ماسوا کو سوخت[1] کردیتی ہے۔

اور یہ وہ آگ ہے کہ پلصراط پر جب مومن کا گذر ہوگا تو نار دوزخ کہے گی۔ جزیا مومن فان نورک اطفأ ناری یعنی اے مومن جلدی گذر جا تیرے نور نے میری آگ کو بجھادیا۔ بزرگان دین نے فرمایا ہے کہ اس نور سے مراد آتش عشق ہے حاجی صاحب کا شعر ہے۔

اگر ظاہر کروں سوز جگر کو　　کروں شرمندہ دوزخ کی شرر کو

مولانا فرماتے ہیں۔

عشق آں شعلہ است کوچوں برفروخت
ہرچہ جز معشوق باشد جملہ سوخت[2]

اور گناہ بھی ماسوا[3] میں داخل ہیں وہ بھی سوختہ ہوجاتے ہیں اس لیے ارشاد فرمایا کہ حج کرنے والا ایسا ہوجاتا ہے جیسے آج ماں کے پیٹ سے پیدا ہو یہ حاصل ہے حج کا اب آپ کو معلوم ہوگیا ہوگا کہ حج کا ذمہ کیا ہے چنانچہ حج کرنے والوں کو دیکھا جاتا ہے کہ بعد حج کے ان پر محبت کا رنگ غالب ہوجاتا ہے اگر کوئی عارض[4] مانع نہ ہوگیا۔

اب ایک شبہ رہ گیا وہ یہ ہے کہ جس کو حج کی استطاعت نہ ہو تو وہ ناقص رہے گا۔ اس لیے کہ طبیعت اس کی مسخر[5] نہ ہوگی۔ اس کا جواب ایک تو یہ ہے کہ میں نے اول بیان کیا ہے کہ نماز روزہ میں بھی تقیدات ہیں اس لیے طبع ان سے مسخر ہوجائیگی لیکن فرق اس قدر ہے۔ کہ حج سے تسخر[6] کامل ہوتی ہے اور نماز

---

(۱) اپنے علاوہ سب کو جلادیتی ہے (۲) عشق وہ شعلہ ہے جب وہ بھڑک جاتا ہے معشوق کے علاوہ ہر چیز کو جلادیتا ہے (۳) گناہ بھی عشق کے علاوہ میں داخل ہیں وہ بھی جل جاتے ہیں (۴) رکاوٹ نہ ہو (۵) فرمانبردار نہیں (۶) لیکن یہ کمال استعداد اور قوت اور موانع کے ارتفاع کے اعتبار سے ہوگا ۱۲ جامع

روزہ سے اس قدر نہیں ہوتی۔ گو رفتہ رفتہ بتدریج کمال حاصل ہوجائے لیکن حج سے دفعتاً ہوجاتی ہے ایسی مثال ہے جیسے کسی لکڑی کو آہستہ آہستہ کاٹو تو مدت کے بعد وہ کٹ جائیگی۔ اور ایک صورت یہ بھی ہے کہ دفعتاً کٹ جائے پس نماز روزہ سے تو بتدریج طبع پر اثر ہوگا اور حج سے فوراً رنگ بدل جائے گا۔

اور دوسرا جواب یہ ہے کہ گو حج نہ کرے لیکن نیت بلکہ شوق ہو تو ہر مومن کو ثواب حج کا ہوتا ہے اور حدیث شریف میں آیا ہے۔ نیۃ المومن خیر من عملہ[1]۔ پس وہ بھی مثل حج کرنے والے ہی کے ہوگا اور اس کے شوق اور دوسری عبادات کے شوق میں بھی فرق ہے اس کا شوق سب سے بڑھ کر ہے چنانچہ دیکھ لو کہ ساری دنیا کے مسلمان حج کے شوق میں مٹے ہوئے ہیں۔ اگر ذرا تذکرہ آجاتا ہے تو ہر مسلمان تمنا ظاہر کرتا ہے اور دعا کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم کو نصیب فرمائے یہ تو ان کا حال ہے جن کو نصیب نہیں ہوا۔ اور جو مشرف ہوچکے ہیں ان کا ایک مرتبہ بلکہ دس مرتبہ سے بھی جی نہیں بھرتا۔ جتنی مرتبہ بھی جاؤ گے جی نہ بھرے گا۔ پھر دل چاہے گا کہ جائیں۔ پس ایسا شوق بھی نائب ہوجاتا ہے۔ اصل کا۔

ایک شبہ اور ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ نماز میں بھی تو قید مکان کی ہے کہ مسجد میں پڑھتے ہیں پس چاہیئے کہ اس سے اسی درجہ کی تسخیر طبع[2] کی ہو۔ جواب یہ ہے کہ مسجد کی قید نماز میں فضیلت کی ہے نفس صلوۃ بغیر اس قید کے بھی ہوجاتی ہے بخلاف حج کے کہ وہ اس مکان کے بدون[3] متحقق نہیں ہوتا۔ اور قید بھی ایسی عجیب وغریب ہے کہ وہ قید بھی خود مقید ہے۔

(۱) مومن کی نیت اس کے عمل سے بہتر ہے (۲) طبیعت مسخر ہوجائے (۳) بغیر نہیں پایا جاتا

حقیقت بیت اللہ

تفصیل اس مجمل کی یہ ہے کہ بیت اللہ شریف نام اس خاص بیت[1] کا اسی وقت تک ہے جب کہ وہ اس مکان خاص اور اس جوئے خاص کے ساتھ مقید[2] ہے چنانچہ اگر اس کے پتھر اٹھا کر دوسری جگہ رکھدیں تو وہ بیت اللہ نہیں ہے لوگ سمجھتے ہوں گے کہ وہ ایک کوٹھا ہے جب اس کو منہدم[3] کردیا جائے تو بس حج گیا یہ نہیں ہے بلکہ اس زمین کا نام بھی نہیں ہے چنانچہ اگر تحت الثریٰ[4] تک وہاں مٹی اٹھا کر دوسری جگہ پھینک دیجائے تب بھی بیت اللہ موجود ہے۔ پس در حقیقت بیت اللہ اس بعد مجرد کا نام ہے جو تحت الثریٰ سے عنان سماء تک[5] ہے نہ کوٹھا بیت اللہ اور نہ زمین چنانچہ اگر کوئی بیت اللہ کے اوپر کسی ایسے مکان کے اوپر نماز پڑھے جو بیت اللہ سے بلند ہے تو نماز ہوجاتی ہے۔

یہاں سے یہ بھی سمجھنا چاہیئے کہ شعائر اسلام کی بنیاد کس قدر قوی ہے کہ ان کا مدار کسی ضعیف اور بے اصل شے پر نہیں اور یہاں سے اس اعتراض کا جواب بھی ہوگیا۔ کہ جو بعض غیر قوموں نے کیا ہے کہ مسلمان بھی بت پرستی کرتے ہیں یعنی کعبہ کی طرف سجدہ کرتے ہیں۔

تقریر جواب کی یہ ہے کہ اول تو ہم خانہ کعبہ کو مسجود[6] نہیں سمجھتے اور دوسرے یہ کہ خانہ کعبہ ان پتھروں کا نام نہیں جیسا کہ ابھی واضح ہوگیا۔ بت پرستی میں تو اگر اس بت کو اٹھا کر پھینکدیا جائے تو اس طرف کوئی سجدہ نہ کرے گا۔

---

(۱) خاص گھر کا (۲) اس خاص جگہ اور خاص فضاء میں مقید ہے (۳) گرادیا (۴) زمین کے آخری سرے تک کی مٹی (۵) بیت اللہ اس فضاء خاص کا نام ہے جو زمین کے نیچے سے لیکر آسمان کے اوپر تک ہے (٦) جس کو سجدہ کیا جائے

تشبیہ بالحجاج

اور اسی تقریر سے قربانی کی حقیقت بھی معلوم ہو گئی کہ وہ ہماری جان کے قائم مقام ہے باقی اور مقامات پر جو سب مسلمان قربانی کرتے ہیں تو اس کا راز یہ ہے کہ حج کے برکات تو انہیں کو حاصل ہوتے ہیں جو حج سے مشرف ہوتے ہیں اور جو وہاں جانے کی استطاعات[1] نہیں رکھتے وہ اس کے برکات سے محروم تھے اس لیے حق تعالیٰ نے حج کا ایک جزو ان پر واجب کردیا کہ تشبیہ بالحجاج[2] سے ان کو بھی ان برکات کا ایک حصہ نصیب ہوجائے اور نیز اول بیان کیا گیا ہے کہ قربانی بھی منجملہ ان مجاہدات کے ہے جو طبیعت کی تسخیر کے لیے ہیں اور طبیعت کی تسخیر کی ہر ایک کو ضرورت ہے اس لیے سب کو یعنی غیر حجاج کو بھی قربانی کا حکم ہوا اور یہ سنت ابراہیمی ہے۔

قربانی کا راز

اور اصل تو اس کی یہ تھی کہ بیٹے کی قربانی کریں لیکن چونکہ ہم ضعیف تھے اور بیٹا اپنی جان سے زیادہ محبوب ہوتا ہے اس لیے بجائے اس کے یہ حکم ہوتا کہ اپنی جان قربان کرو اس لیے کہ اپنی جان دینا بھی لوازم عشق سے ہے۔ چنانچہ بعض بزرگوں کو یہ دولت نصیب بھی ہوئی کہ خانہ کعبہ پہنچ کر انہوں نے اپنی جان دیدی ہے حضرت نجم الدین کبریٰؒ نے یا کسی اور بزرگ کا قصہ ہے کہ ایک شخص آپ کی مجلس میں اس مصرع کا تکرار کرنے لگا۔ ع

جاں بدہ جاں بدہ جاں بدہ[3]۔ حضرت کو جوش ہوا اور فرمایا کہ میاں محبوب جان مانگ رہے ہیں اور کوئی اتنا نہیں ہے کہ جان دیدے اور یہ کہہ کر فرمایا جان دادم

(۱) طاقت (۲) حاجیوں کے ساتھ مشابہت اختیار کرنے سے (۳) جان دیدو جان دیدو جان دیدو

جان دادم و جان دادم[1] اور وصال[2] ہو گیا- پس اصل تو عشق کا مقتضیٰ جان دینا ہے-

اور اگر وہ جان مانگتے تو حق تھا- چنانچہ ارشاد بھی ہے- **ولو انا کتبنا علیھم ان اقتلوا انفسکم**[3] الخ اور وہ تو سلطان السلاطین ہیں دنیا کے حکام جب ایسے خطرناک موقعوں پر لے جاتے ہیں کہ جہاں جان کا خطرہ ہے اور انکار نہیں کرتے تو وہ تو بطریق اولیٰ اس کے مستحق ہیں خاص کر جب کہ جان بھی ہماری نہ ہو ان کی ہی دی ہوئی ہو اگر وہ جان لے لے تو کیا حرج ہے- مولانا تو اہل اللہ کے لیے فرماتے ہیں-

آنکہ جان بخشد اگر بکشد رواست　　نائب است او دست او دست خدا است

ہمچو اسمٰعیل بہ پیشش سر بنہ　　شاد زخنداں پیش تیغش جان بدہ[4]-

یعنی اسمٰعیل علیہ السلام کی طرح تفویض محض کردو کہ جب ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا **انی اری فی المنام انی اذبحک فانظر ماذا تری**[5]- یعنی بیٹا میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ تم کو ذبح کرتا ہوں تم سوچ کر اپنی رائے بتلاؤ- **قال یابت افعل ماتؤمر. ستجدنی انشاأللہ من الصابرین**[6]- یعنی اسماعیل علیہ السلام نے فرمایا اے ابا آپ کو جو حکم ہوا ہے آپ کیجیے انشاء اللہ تعالیٰ آپ مجھ کو صابرین سے پائیں گے- اللہ اکبر کیسے باپ بیٹے تھے کہ دونوں راضی ہو گئے چنانچہ ابراہیم علیہ السلام نے ان کو بچھاڑ[7] کر ان کے گلے پر چھری چلادی- لیکن حق تعالیٰ نے بجائے ان کے ایک مینڈھے کو رکھ دیا اور وہ ذبح ہو گیا- چنانچہ ارشاد

---

(۱) میں اپنی جان پیش کرتا ہوں میں اپنی جان پیش کرتا ہوں میں اپنی جان پیش کرتا ہوں (۲) اور انتقال ہو گیا (۳) اور اگر ہم ان پر فرض کر دیتے کہ اپنے آپ کو قتل کرو (۴) سورۃ النساء آیت ۶۶ (۵) سورۃ الصّٰفّٰت آیت ۱۰۲ (۶) سورۃ الصّٰفّٰت آیت ۱۰۲ (۷) نیچے لٹا کر

ہے۔ وفدیناہ بذبح عظیم [1]۔ وہ مینڈھا جان کا فدیہ ہو گیا۔ اس سے معلوم ہو گیا کہ قربانی جان کا عوض ہے

بیان زکوۃ

غرض اس تمام تقریر سے قربانی کا راز بھی معلوم ہو گیا اور بحمد اللہ یہاں تک اسلام کے تمام ارکان کے اسرار کا بقدر ضرورت بیان ہو گیا۔ صرف ایک رکن باقی رہ گیا ہے زکوۃ لیکن اس کے اسرار بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس لیے کہ اس میں عقلیت کی شان اغلب [2] ہے اس لیے کہ مالی اعانت [3] مساکین کی کیسی شے ہے کہ اس کے استحسان [4] میں کسی عاقل کو کلام نہیں ہے اور نیز اس میں کسی مکان یا زمان خاص کی بھی قید نہیں یعنی کوئی زمانہ ایسا نہیں ہے کہ اس وقت اگر ادا نہ کریں تو یہ عبادت قضا ہو جائے۔ باقی چالیسویں حصہ کی تعیین یہ سہولت کے لیے ہے اس لیے کہ چالیس روپیہ میں سے ایک روپیہ دیدینے سے کوئی حرج نہیں ہے۔ نصاب مقرر فرمانا یہ معنیٰ سہولت کے لیے ہے مصارف جو مقرر فرمائے ہیں کہ نہ بیٹا ہو نہ پوتا نہ باپ نہ دادا ہو یہ اس لیے ہے تاکہ نفس پر گراں ہو اس لیے کہ ان لوگوں کو دینے سے نفس کو کچھ گرانی نہ ہوگی۔ حاصل یہ ہے کہ اول تو اس میں بہ نسبت اور مجاہدات کے قیدیں ہی کم ہیں اور جو قیدیں ہیں وہ سب ایسی ہیں کہ اجمالاً ہر شخص ان کا راز سمجھ سکتا ہے گو تفصیلاً اس میں بھی بعض قیود تعبدی [5] ہیں اور ایسا ہونا بھی چاہیے تاکہ اس میں بھی مثل نماز کے عقلیت غالب اور دوسری حیثیت مغلوب ہو۔ مگر چونکہ زیادہ حصہ اس میں معقول ہے اس لیے اس کو مستقل بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔

---

(۱) سورۃ الصّٰفّٰت آیت ۱۰۷ (۲) زیادہ غالب ہے (۳) امداد کرنا (۴) اچھے ہوتے ہیں (۵) عبادت کی قیدیں

جذب و سلوک

خلاصہ یہ ہے کہ نماز اور روزہ میں تو عقلیت غالب ہے اور تعبدیت[1] مغلوب اور زکوٰۃ میں عقلیت اغلب[2] ہے اور تعبدیت بہت کم بمنزلہ اس کے کہ گویا نہیں ہے اور حج میں طبیعت اور تعبدیت[3] اغلب ہے اور عقلیت نہایت کم، اور ہر قسم کے مجاہدہ کا جدا اثر ہے جس میں عقلیت غالب اور یا اغلب ہے وہ عقل کی تعدیل کے لیے ہیں اور جس میں طبیعت کا غلبہ ہے وہ طبیعت کی تسخیر کے لیے ہیں اور جن میں عقلیت غالب ہے ان کا اثر سلوک ہے اور جن میں طبیعت غالب ہے ان کا اثر جذب ہے اور یہ دو طریق ہیں قبول کے۔ چنانچہ ان دونوں طریقوں کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے۔ **اللّٰہ یجتبی الیہ من یشاء و یھدی الیہ من ینیب**[4]۔ اجتباء سے طریق جذب اور ہدایت سے طریق سلوک کی طرف اشارہ ہے اور ہم کو اللہ تعالیٰ نے دونوں قسم کے مجاہدے عطا فرمائے ہیں کہ ان کے حقوق ادا کرنے سے جذب[5] اور ہدایت سے طریق سلوک[6] کی طرف اشارہ ہے اور ہم کو اللہ تعالیٰ نے دونوں قسم کے مجاہدے عطا فرمائے ہیں کہ ان کے حقوق ادا کرنے سے جذب اور سلوک حاصل ہوجاتا ہے۔ پس نہ خلوات طویلہ[7] کی ضرورت ہے اور نہ ترک لذات[8] کی حاجت ہے اور نہ تعلقات قطع کرکے گوشہ اختیار کرنے کی ضرورت ہے ان ہی مجاہدات سے سب کچھ ہوجاتا ہے ہاں بصیرت و خلوص کی بے شک ضرورت ہے۔ پس خلاصہ اول رمضان سے اب تک مواعظ کا یہ ہوا کہ سلوک اور جذب کی تعلیم ہے۔ اب اللہ تعالیٰ سے دعا کرو کہ توفیق عطا فرماویں۔ آمین ثم آمین۔

---

(۱) بندگی کی شان مغلوب ہے (۲) عقل کی شانِ زیادہ غالب ہے (۳) طبیعت اور بندگی کی شان زیادہ غالب ہے (۴) سورۃ شوریٰ آیت ۱۳ (۵) اللہ کی طرف طبیعت کا کھینچنا (۶) تصوف کے راستہ کو طے کرنے کی طرف اشارہ ہے (۷) زیادہ تنہائی کی (۸) نعمتوں کو چھوڑنے کی

بعضے مقولات منقولات از شبلیؒ مشتمل بر بعضے رموز حج بتائید بعضے مضامین وعظ ہذا

حضرت ابو بکر شبلیؒ نے اپنے بعض متعلقین سے دریافت کیا کہ تو نے حج کی نیت منعقد کی تھی اس نے کہا ہاں۔ انہوں نے پوچھا جتنے علاقے اس کے مخالف تیری پیدائش کے وقت سے تھے تو نے سب کو قطع[1] کردیا تھا۔ اس نے کہا نہیں۔ شبلی نے کہا تو بس حج کی تو نے نیت ہی منعقد نہیں کی (کیونکہ نیت حج کی روح یہی قطع تعلقات ما سوی اللہ[2] ہے جب یہ نہ ہوا تو ظاہر ہے نیت مثل جسد بلا روح[3] کے جو غیر معتد بہ ہے)

پھر شبلیؒ نے اس سے پوچھا تو نے (احرام کے وقت پہلے سلے ہوئے) اپنے کپڑے اتارے تھے اس نے کہا ہاں شبلیؒ نے پوچھا کیا (کپڑے اتارنے کے وقت) تو ہر چیز سے مجرد[4] ہوگیا تھا۔ اس نے کہا نہیں۔ شبلیؒ نے کہا تو بس تو نے کپڑے ہی نہیں اتارے (کیونکہ ان کپڑوں کے اتارنے کی روح یہی تجرد عما سوی[5] اللہ ہے)۔ بدوں اس کے کپڑے اتارنا جسد بلا روح ہے)۔

پھر شبلیؒ نے پوچھا تو نے (احرام کے وقت) وضو یا غسل کیا تھا اس نے کہا ہاں شبلیؒ نے پوچھا تیرے وضو یا غسل کے وقت تجھ سے تمام (باطنی) علتیں دور ہوگئی تھیں اس نے کہا نہیں شبلیؒ نے کہا کہ تو نے بس وضو و غسل ہی نہیں کیا۔ (کیونکہ اس طہارت ظاہری کی روح یہی طہارت باطنی ہے جب یہ نہیں تو وہ کالعدم[6] ہے۔ پھر شبلیؒ نے اس سے پوچھا کہ تو نے (احرام کے وقت) لبیک

---

(۱) توڑ دیا تھا (۲) اللہ کے علاوہ سب سے تعلق توڑنے کا نام ہے (۳) جیسے جسم بغیر روح کے (۴) خالی (۵) اللہ کے سوا سب سے اپنے کو فارغ کرنا (۶) نہ ہونے کے برابر

کہی تھی اس نے کہا ہاں۔ شبلیؒ نے پوچھا تو نے لبیک کا جواب ویسے ہی لبیک سے پایا تھا۔ اس نے کہا نہیں شبلیؒ نے کہا تو بس تو نے لبیک ہی نہیں کہی۔ (کیونکہ اس لبیک یعنی حاضری کی روح محبوب کی طرف سے قرب و حضور کی دولت کا میسر ہونا ہے۔ جس کا اثر قلب پر ظاہر ہوتا ہے۔ بدوں اس کے لبیک کہنا خالی لفظ ہے)۔

اور اپنے بعض متعلقین سے جو حج کر کے آیا تھا۔ حضرت شبلیؒ نے پوچھا (غالباً یہ کوئی اور شخص ہوگا اور ممکن ہے کہ پہلا ہی ہو مگر تفریق اجزاء قصہ کے سبب ناقل نے لفظوں میں ایسا عنوان اختیار کیا ہو جو دونوں شخصوں کے متغائر ہونے کا موہم ہو غرض اس سے پوچھا) کہ تو مسجد (حرام) میں داخل ہوا تھا اس نے کہا ہاں۔ انہوں نے پوچھا کہ تو نے کسی مقام قرب میں داخل ہونا بھی معلوم کیا اس نے کہا نہیں انہوں نے کہا تو بس تو مسجد ہی میں داخل نہیں ہوا۔ (کیونکہ دخول مسجد کی روح دخول مقام قرب ہے جس کا اثر قلب پر ہوتا ہے اور جسد بلا روح کالعدم[1] ہے) پھر شبلیؒ نے اس سے پوچھا تو نے کعبہ کو دیکھا اس نے کہا ہاں! انہوں نے کہا کہ تو نے اس کو بھی دیکھا جس کے لیے خود کعبہ کا قصد کیا تھا۔ (یعنی حضرت حق اور یہ رؤیت بالقلب[2] ہوتی ہے) اس نے کہا نہیں شبلیؒ نے کہا تو بس تو نے کعبہ ہی کو نہیں دیکھا۔ (کیونکہ روح رؤیت کعبہ کی یہی تھی یہ نہیں تو وہ محض جسد[3] ہے)۔

پھر شبلیؒ نے اس سے پوچھا کہ تو (طواف میں) تین بار دوڑ کر اور چار بار آہستہ چلا تھا اس نے کہا ہاں انہوں نے پوچھا کیا تو دنیا سے اس طرح بھاگ گیا کہ تجھ کو معلوم ہو گیا ہو کہ اس سے جدا ہو گیا ہو گیا۔ اور وہ تجھ سے منقطع ہو گئی (کہ یہ بھاگنا

(۱) جسم بغیر روح کے نہ ہونے کے برابر ہے (۲) اور یہ دیدار دل سے ہوتا ہے (۳) صرف جسم ہے

روح ہے) اس طواف میں دوڑنے کی) اور کیا تو نے اپنے چار بار آہستہ چلنے میں اس (بلائے دنیا) سے امن پایا۔ جس سے تو بھاگا تھا پھر اس پر تو نے مزید شکر کیا ہو کہ اس امن کا معلوم ہونا روح ہے۔ اس آہستہ چلنے کی کیونکہ امن میں آہستہ چلتے ہیں اور خوف و بلا میں دوڑ کر پس یہ دونوں رفتاریں اشارہ ہے اس خوف اور امن کی طرف) اس نے کہا نہیں۔ شبلیؒ نے کہا تو بس تو طواف میں دوڑ کر ہی نہیں چلا (یعنی یہ چلنا محض صورت بے معنی ہوا۔ اور اسی طرح آہستہ چلنا بھی)۔

پھر اس سے پوچھا تو نے حجراسود سے مصافحہ کیا تھا اور اس کو بوسہ دیا تھا اس نے کہا ہاں انہوں نے ایک چیخ ماری اور کہا کمبختی[1] مارے واللہ یہ کیا گیا ہے (یعنی اکابر نے کہا ہے) کہ جو شخص حجر اسود سے مصافحہ کرتا ہے وہ خدا تعالیٰ سے مصافحہ کرتا ہے اور جو خدا تعالیٰ سے مصافحہ کرتا ہے وہ مقام امن میں آجاتا ہے۔ (یعنی دوزخ سے محفوظ ہوجاتا ہے) کیا تجھ پر کچھ اثر امن کا ظاہر ہوا (مثلاً معاصی سے نفرت ہوگئی ہو کہ جو سبب ہے دوزخ میں جانے کا کہ یہ ظہور ہے اثر امن کا) اس نے کہا نہیں۔ شبلیؒ نے کہا تو بس تو نے (حجر اسود سے) مصافحہ ہی نہیں کیا (کیونکہ جب اس میں روح نہیں تو جسد محض صورت بے معنیٰ ہوا)۔

اور ایک شخص سے جس نے حج کیا تھا خواہ وہ پہلا ہی شخص ہو یا کوئی اور ہو جیسے یہی دو احتمال اوپر آچکے ہیں) حضرت شبلیؒ نے کہا کیا خدا تعالیٰ کے رو برو مقام ابراہیم کے پیچھے کھڑا ہوا تھا اور دو رکعت (طواف) کی پڑھی تھیں اس شخص نے کہ ہاں! شبلیؒ نے پوچھا کہ تیرا جو مرتبہ خدا تعالیٰ کے نزدیک ہے تو اس پر بھی قائم ہوا۔ پھر تو نے اپنا مقصود بھی ادا کیا۔ (جس کی طرف اشارہ ہے مقام ابراہیم پر کھڑے ہو کر نماز ادا کرنا یعنی خدا تعالیٰ کے نزدیک ایک مرتبہ قرب کا حاصل ہو اور

(۱) بد نصیب

خاص قرب کے مناسب جو مناجات و مکالمت ہے وہ میسر ہو) اس نے کہا نہیں انہوں نے کہا بس تو نے نماز ہی نہیں پڑھی۔ (کیونکہ جب اس نماز کی روح ہی نہیں تو قالب[1] بے جان ہے)

اور ایک شخص سے (کہ وہی شخص مذکور تھا یا دوسرا) حضرت شبلیؒ نے کہا کہ تو کوہ صفا کی طرف گیا تھا۔ اس نے کہا ہاں شبلیؒ نے پوچھا کہ تجھ سے تمام علتیں[2] دور ہو گئیں تھیں یہاں تک کہ تو سب سے) صاف ہو گیا تھا۔ (جیسا مادہ صفا میں بھی اس طرف اشارہ ہے۔ ونیز صفا سے ابتداء ہوتی ہے حرکت سعی کی اور حرکت مسلمان کی تہذیب نفس کے لیے ہونا احق ہے اس لیے بھی اس حرکت کی روح زوال علل[3] ہے۔ اس شخص نے کہا نہیں شبلیؒ نے کہا تو بس تو نہ صفا پر چڑھا اور نہ اترا۔

پھر شبلیؒ نے کہا کیا تو (صفا و مروہ کی سعی میں میلین اخضرین کے درمیان دوڑا بھی تھا۔ اس نے کہا ہاں شبلی نے کہا تو کیا اپنے سامان (ہوس[4]) سے بھاگ کر اپنی ہستی (کی حقیقت پہچاننے) تک پہنچا (کہ روح اس دوڑنے کی یہی ہے اور مسلمان کے لیے یہی دوڑنا لائق ہے کہ پندار کو حذف کر کے اپنی ہستی فانی پر نظر کر کے حق عبدیت ادا کرے) اس شخص نے کہا نہیں شبلیؒ نے فرمایا بس تو دوڑا ہی نہیں۔

پھر شبلیؒ نے پوچھا تو نے مروہ پہنچ کر (اپنے نفس میں) سکون (وطمانیت علی المرضیات الالہی) کو پایا کہ اس کو تو نے حاصل کیا ہو اور اس کا تجھ پر نزول ہوا (کہ

---

(۱) جسم (۲) گناہوں کی بیماریاں (۳) بیماریوں کا زائل ہونا ہے (۴) منقول عنہ میں یہ عبارت تھی ففررت من زادک ووصلت الی جودک۔ اسی پر ترجمہ کیا گیا اور جی کو یہ لگتا ہے کہ یہ عبارت اس طرح ہے۔ من ہواک الی معبودک۔ واللہ اعلم

مروہ پر اخیر پھیرے میں حرکت سعی ختم ہوتی ہے گویا یہ اشارہ ہے اس سکون نفس کی طرف جو بعد حرکت مجاہدہ کے میسر ہوتا ہے) اس شخص نے کہا نہیں۔ شبلیؒ نے کہا بس تو مروہ ہی پر نہیں پہنچا۔

اور شبلیؒ نے ایک حج کرنے والے شخص سے (کہ وہی شخص سابق تھا یا اس کے علاوہ دوسرا) پوچھا تو منی کیطرف گیا تھا اس نے کہا ہاں شبلیؒ نے پوچھا کیا تو نے (وہاں پہنچ کر) غیر حالت معصیت کی تمنا کی تھی اس نے کہا نہیں۔ شبلیؒ نے فرمایا تو بس تو منیٰ ہی میں نہیں گیا۔ (کیونکہ منیٰ کے مادہ میں مینہ بمعنیٰ آرزو سے مناسبت ہے تو اس میں اس آرزو کی طرف اشارہ ہے)

پھر حضرت شبلیؒ نے اس سے پوچھا کہ تو مسجد خیف میں (جو کہ منیٰ میں ہے) داخل ہوا تھا۔ اس شخص نے کہا ہاں! شبلیؒ نے کہا تو نے اپنے اس آنے جانے میں خدا تعالیٰ سے خوف کیا تھا اور تو نے (اپنے دل میں) خوف کا ایسا درجہ پایا تھا جو اسی مقام میں تجھ کو حاصل ہوتا ہو۔ اس شخص نے کہا نہیں حضرت شبلیؒ نے فرمایا تو بس تو مسجد خیف میں داخل نہیں ہوا (کیونکہ لفظ خیف کو مناسبت ہے لفظ خیفہ سے جس میں کسرہ ما قبل اور خود ساکن ہونے سے واو کو ی سے بدل لیا گیا ہے اور اس کی اصل خوف ہے پس وہاں جانا مذکر ہونا چاہیئے۔ خوف حق کا جب یہ نہ ہوا تو وہاں جانا نہ جانا برابر ہوا۔ اور حضرت شبلیؒ دخول خیف و منیٰ و صعود و صفا میں الفاظ کو مذکر احوال کا قرار دیا کہ عبرت کے لیے ایسے اشارات و مناسبات بھی کافی ہیں اسی طرح آگے لفظ عرفات میں اسی مناسبت کا اعتبار فرمایا۔

اور شبلیؒ نے ایک شخص سے جس نے حج کیا تھا (یہاں بھی وہ دونوں احتمال ہیں اور اغلب مغائرت ہے) فرمایا تو عرفات گیا تھا اس شخص نے کہا ہاں! حضرت شبلیؒ نے فرمایا کیا تو نے اس حالت کی معرفت حاصل کی جس کے لیے تو

(ماضی میں) پیدا کیا گیا ہے اور (اسی طرح) اس حالت کی جس پر تو (فی الحال وارد) ہوتا رہتا ہے اور (اسی طرح) اس حالت کی جس کی طرف تو (مستقبل میں) رجوع کریگا۔ اور کیا معرفت بخشنے والے نے تجھ کو ان حوال کی معرفت کرائی۔ اور کیا تونے اس مکان کو دیکھا۔ جس کی طرف یہ سب اشارات (مذکورہ) ہیں؟ مکاں سے مراد مقام معرفت اور اشارات سے مراد عرفات کا حوال مذکورہ کی معرفت کی طرف مشیر ہونا) کیونکہ یہی مقام ہے جس نے انفاس عمر کو احوال مذکورہ میں سے ہر حال میں غم سے رہائی دی ہے۔ (یعنی حالات ماضیہ وحالیہ و استقبالیہ مذکورہ کو اسباب معصیت سے بعید رکھنا یہ شعر معرفت ہی کا ہے) اس شخص نے کہا نہیں حضرت شبلیؒ نے فرمایا تو بس تونے وقوف عرفات ہی نہیں کیا (کیونکہ عرفات سے ان ہی معارف کی طرف اشارہ ہے جس کی مناسبت کا ابھی اوپر دخول مسجد خیف میں ذکر ہوا ہے)۔

اور حضرت شبلیؒ نے ایک شخص سے جس نے حج کیا تھا۔ (خواہ وہ حج اول ہو یا غیر اول[1]) فرمایا تو مزدلفہ کی طرف واپس آیا تھا۔ اس شخص نے کہا ہاں! انہوں نے پوچھا تونے مشعر حرام (جوکہ مزدلفہ میں ہے) دیکھا تھا۔ اس نے کہا ہاں انہوں نے کہا تونے وہاں اللہ تعالیٰ کا ایسا ذکر کیا تھا جس نے ماسویٰ کو بھلا دیا ہو اور تو اس میں مشغول ہو گیا ہو۔ (جس کا حکم اس آیت میں ہے۔ فاذا افعنتم من عرفات فاذکروا اللہ عندالمشعرالحرام[2] الخ۔ اور ظاہر ہے کہ ذکر میں درجہ مطلوبہ وہ ہے جس میں ماسویٰ سے انقطاع[3] ہو کما قال اللہ تعالیٰ واذکراسم ربک و تبتل الیه تبتیلاً الخ[4] اس نے کہا

---

(۱) وہ پہلا شخص یا اس کے علاوہ کوئی اور (۲) البقرہ آیت ۱۹۸ (۳) اللہ کے سوا سب سے قطع تعلق ہو
(۴) المزمل آیت ۸

نہیں۔ انہوں نے فرمایا بس تو نے وقوف مزدلفہ نہیں کیا۔ (کیونکہ وہاں جو حکم تھا وہ نہ بجالایا۔ اور حضرت شبلیؒ نے ایک شخص سے اپنے متعلقین میں سے جس نے حج کیا تھا فرمایا تو منیٰ میں داخل ہوا تھا۔ (اور یہی سوال پہلے ایک شخص سے آچکا تھا۔ اور ظاہر ہے کہ ایک شخص سے دو بار سوال بیکار ہے یہ قرینہ قویہ تحریہ ہے کہ یہاں مخاطب اور ہے اور یہی ظن غالب سب جگہ ہے اس شخص نے کہا ہاں انہوں نے پوچھا تو نے وہاں (جانور) ذبح کیا تھا۔ اس نے کہا ہاں پوچھا اپنے نفس کو بھی (ذبح کیا تھا جس کی طرف اشارہ ہے ذبح حیوان میں) اس نے کہا نہیں انہوں نے کہا تو بس تو نے ذبح ہی نہیں کیا۔

پھر حضرت شبلیؒ نے فرمایا تو نے رمی جمار (۳) کیا تھا اس شخص نے کہا ہاں! انہوں نے پوچھا کیا تو نے اپنے جہل کو اپنی ترقی علم سے پھینک دیا تھا جس کا تجھ پر ظہور ہوا ہو (کہ رمی بمعنیٰ پھینکنا اس کی طرف اشارہ ہے) اس شخص نے کہا نہیں انہوں نے کہا تو بس تو نے رمی ہی نہیں کیا۔

پھر انہوں نے پوچھا کہ تو نے سر منڈایا تھا اس شخص نے کہا ہاں۔ انہوں نے کہا کیا تو نے اپنی ہوسیں اپنے سے زائل کردی تھیں (کہ سر منڈانا اشارہ اس ازالہ کی طرف ہے) اس شخص نے کہا نہیں انہوں نے فرمایا تو بس تو نے حج ہی نہیں کیا۔

اور حضرت شبلیؒ نے اپنے متعلقین میں سے ایک شخص ہے جس نے حج کیا تھا۔ پوچھا کیا تو نے طواف زیارت کیا اس نے کہا ہاں! انہوں نے پوچھا کیا تجھ کو کوئی بات خیر ت میں سے مکشوف ہوئی؟ یا تو نے اپنے اوپر کچھ زیادات کرامات زیارت کے سبب دیکھی؟ کیونکہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ حج کرنے والے اور

---

(۱) شیطان [illegible]

عمرہ کرنے والے اللہ تعالیٰ کی زیارت کرنے والے ہوتے ہیں اور جس کی زیارت کے واسطے کوئی جاوے اس پر حق ہوتا ہے کہ اپنی زیارت کے لیے آنے والوں کی خاطر داری کرے (سو تجھ کو کوئی اکرام بھی محسوس ہو) اس نے کہا نہیں۔ انہوں نے کہا تو بس تو نے طواف زیارت ہی نہیں کیا۔

پھر انہوں نے اس سے پوچھا کیا تو حلال ہوا تھا (یعنی احرام کھولدیا تھا جس سے سب ممنوعات احرام کے حلال ہوجاتے ہیں) اس نے کہا ہاں! انہوں نے پوچھا کیا تو نے اکل حلال کا عزم کیا تھا اس نے کہا نہیں۔ انہوں نے فرمایا تو بس حلال ہی نہیں ہوا۔

اور حضرت شبلیؒ نے اپنے متعلقین میں سے ایک شخص سے جس نے حج کیا تھا۔ پوچھا تو نے طواف وداع کیا تھا۔ اس نے کہا ہاں۔ انہوں نے پوچھا کیا تو اپنے نفس اور روح سے بالکلیہ نکل گیا تھا۔ (کہ طواف وداع اس وداع نفس و روح کی طرف اشارہ ہے)۔ اس شخص نے کہا نہیں انہوں نے فرمایا تو بس تو نے طواف وداع ہی نہیں کیا تجھ پر دوبارہ جانا لازم ہے اور (دوبارہ حج میں) غور کرنا کہ کس طرح حج کیا جایا کرتا ہے۔

بعد ان تمام مضامین کے جو میں نے تمام مناسک میں تجھ سے ذکر کیے ہیں کیونکہ میں تجھ کو سب بتلاچکا اور جب تو (اب کی بار) حج کرے تو اس امر کی کوشش کر کہ وہ حج ایسا ہو۔ جیسا میں نے تجھ سے بیان کیا۔ (اس سے ظاہراً معلوم ہوتا ہے کہ تمام سوالات کا مخاطب ایک ہی شخص ہے سو اگر مخاطب متعدد ہوں جیسے اس کا اظہر ہونا پہلے آچکا ہے تو اس کی توجیہ یہ ہوگی کہ انہوں نے اس مخاطب اخیر کے روبرو ان سب سائلوں کے مخاطبات کو بھی نقل کرایا ہوگا۔

من رسائل الارکان البحر العلوم رحمه الله تعالیٰ

تمت بالخیر